طلوعِ اسلام

نومبر ۱۹۵۳

مقصد اور طلوعِ اسلام کا مسلک

ہمارا مسلک یہ ہے کہ ——————

۱ تنہا عقلِ انسانی، زندگی کے مسائل حل کرنے کیلئے کافی نہیں۔ اسے اپنی راہنمائی کیلئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی۔

۲ یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اس لئے نوعِ انسانی قرآن کے بغیر اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتی۔

۳ حق اور باطل کا معیار قرآن ہے۔ ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے صحیح ہے، جو اس کے خلاف ہے غلط ہے۔

۴ حضور نبی اکرمؐ انسانی تاریخ کے بلند ترین مقام پر فائز تھے لیکن بایں ہمہ بشر تھے۔ حضورؐ کی ذات سے متعلق کوئی ایسی چیز جس سے حضورؐ کی بشریت و انسانیت پر حرف آتا ہو، ہماری تاریخ کی کتابوں میں ملے، خواہ وہ کسی کتاب میں کیوں نہ ہو، غلط اور وضعی ہے۔ حضورؐ کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔

۵ قرآن کی رو سے دنیا میں بسنے والے تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ اس کا صحیح حل یہ ہے کہ تمام دنیا ایک نظام کے مطابق زندگی بسر کرے۔

۶ اس عالمگیر نظامِ زندگی کی تشکیل کی صورت یہ ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قرآن کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے جزئی قوانین خود مرتب کریں۔ انہی قوانین کو شریعت کہا جاتا ہے۔ یہ جزئی قوانین حالات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہیں گے لیکن قرآن کے اصول ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے۔

۷ اس نظام کی رو سے قرآن ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے جس میں تمام افراد کی مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو اور کوئی فرد معاشرہ اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے۔ اسے ربوبیتِ عالمین کہتے ہیں یعنی تمام نوعِ انسانی کی پرورش کی ذمہ داری۔

۸ ربوبیتِ عالمین کے مقصدِ عظیم کے حصول کیلئے قرآن کی رو سے ضروری ہے کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت کے بجائے معاشرہ کی تحویل میں رہیں تاکہ رزق کی تقسیم ایک ایسے نظام کے ماتحت ہو سکے جس سے کوئی انسان ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے۔ اسے قرآنی نظامِ ربوبیت کہا جاتا ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ ابتداءً پاکستان میں اور اس کے بعد ساری دنیا میں قرآنی نظامِ ربوبیت قائم ہو جائے تاکہ عقل و فکر کی روشنی میں انسان کی تمام مضمر صلاحیتوں کی کامل نشوونما ہو سکے اور اس طرح سرزمین پاکستان نورِ ربہا سے جگمگا اٹھے۔

اگر آپ طلوعِ اسلام کے اس مسلک اور مقصد سے متفق ہیں تو آپ ہی مرکز میں طلوعِ اسلام کا ساتھ دیجئے

-/10/-

ترجمان حقیقت محترم پرویز صاحب کے قلم سے

سلیم کے نام خطوط

ہمارے نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق جسقدر شکوک پیدا ہوتے ہیں ان کا نہایت شگفتہ شاداب اور سائنٹفک انداز میں تسکین بخش جواب

ان خطوط میں ملت کے اس نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو مخاطب کیا گیا ہے جو مشرق و مغرب کے تصادم کے بعد دور ملوکیت کے وضع کردہ غلط مذہبی تصورات سے متنفر ہوتے ہوتے اسلام اور اس کے سرچشمہ حیات، قران سے بھی ہاتھ دھو چلا تھا۔ عقائد و نظریات جیسے خشک اور نازک مسائل پر اس عمدگی سے بحث کی گئی ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی خشک فلسفیانہ بحث کو پڑھ رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں وہ دقیق اور معرکہ آراء مسائل حل کرکے رکھ دئے گئے ہیں جنھیں ضخیم مجلدات میں بھی حل نہیں کیا جاسکا تھا۔ یہ خطوط ملک کے گوشہ گوشہ سے خراج تحسین وصول کرچکے ہیں۔ قران کی روشنی اور محترم پرویز صاحب کا بصیرت افروز قلم۔ اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اس مجموعہ میں وہ خطوط بھی شامل ہیں جو طلوع اسلام میں شائع ہوچکے ہیں اور وہ بھی جو ابتک کہیں شائع نہیں ہوئے۔

کتاب بڑے سائز کے قریب سوا چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ سفید۔ گرد پوش مصور مشرق جناب چغتائی کے حسین قلم کا مرقع۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف چھ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام
کومی روڈ (صدر)۔ کراچی

اسلامی حیات اجتماعیہ کا ماہوار مجلّہ

طلوع اسلام

کراچی

بدل اشتراک	مُرتّب	قیمت فی پرچہ
سالانہ: چھ روپے پاکستانی (نو روپے ہندوستانی)	سعید احمد	دس آنے (پاکستانی)
غیر ممالک سے ۲۱ شلنگ		بارہ آنے (ہندوستانی)

نمبر ۱۱	نومبر ۱۹۵۳ء	جلد ۶

فہرست مضامین

قرآن نے کیا کہا؟	۴	حلقہ معاونین طلوع اسلام	۴۲
اسلامک کانسٹی ٹیوشن	۵	حقائق و عبر - (۱) ہندوستان میں	۴۳-۴۹
لمعات	۶-۱۲	(۲) کشمیر کا مسئلہ	
ہفتہ وار طلوع اسلام	۱۳-۱۴	(۳) مولویوں کی کہانی خود مولویوں کی زبانی	
ذوق نظر	۱۵	(۴) تنکوں کے پُل	
سید ابوالاعلیٰ مودودی منکر حدیث ہے	۱۶-۱۸	(۵) رسولؐ اللہ حنفی تھے یا شافعی؟	
نظام صلوٰۃ - (محترم عرشی صاحب)	۱۹-۲۵	دنیا کی نجات	۵۱-۶۱
استدراک	۲۶-۳۴	(محترم پرویز صاحب)	
باب المراسلات: (۱) نزول حضرت عیسیٰؑ	۳۵-۴۱	رفتار عالم	۶۳-۷۰
(۲) تین وقتوں کی نماز		رجم کا ناقابل تردید ثبوت	۷۱-۷۲

قرآن نے کیا کہا؟

دنیا کی ہر قوم اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہتی ہے کہ وہ کس طرح باقی اقوامِ عالم کے مقابلہ میں بڑائی اور کبریائی حاصل کر سکتی ہے۔

اس مقصد کے لئے کوئی قوم یہ سوچتی ہے کہ وہ اپنی مصنوعات کو اتنی ترقی دے کہ باقی قومیں اپنی ضروریاتِ زندگی کیلئے اس کی محتاج ہو جائیں۔ کوئی یہ سوچتی ہے کہ وہ اپنی تجارت کو اس قدر عالمگیر بنا دے کہ ساری دنیا کی دولت سمٹ کر اس کے خزانوں میں آجائے۔ کوئی سوچتی ہے کہ وہ بساطِ سیاست پر اس قسم کی مہرہ بازی کرے کہ باقی قوموں کی سب چالیں مات پڑ جائیں۔ کوئی کہتی ہے کہ ہم چھوٹی چھوٹی قوموں کو ساتھ ملا کر اپنا جتھہ اتنا مضبوط کر لیں کہ کسی قوم کو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی ہمت نہ پڑے۔ کوئی کہتی ہے کہ نہیں! دنیا میں قوت کا راز اسلحہ ہے۔ ہم اپنے ہتھیاروں کو اسقدر محکم بنا لیں کہ اس آہنی دیوار کو کوئی توڑ نہ سکے اور ان میں ایسے ایسے اضافے کرتے رہیں جن کا جواب کسی کے پاس نہ ہو۔

یہ سب قومیں اسی انداز سے سوچتی ہیں اور اپنے اپنے طور پر مطمئن ہو جاتی ہیں کہ اگر ہم نے یوں کر لیا تو پھر ہمیں راستے سے ہٹانے والا کوئی نہیں ہو سکتا۔

لیکن قرآن کہتا ہے کہ یہ سب تجویزیں غلط ہیں۔ تم ان میں سے جو جو تدبیر چاہے کر کے دیکھ لو

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ (۷/۱۴۶)

ہم اپنے قوانین کے زور سے ان تمام لوگوں کو زندگی کی راہ سے ہٹا کر الگ کر دینگے جو یہ چاہتے ہیں کہ (نوعِ انسانی کیلئے) ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کئے بغیر دنیا میں بڑائی اور کبریائی حاصل کر لیں۔

بڑائی اور کبریائی صرف اسے حاصل ہوگی جو مثبت تعمیری نتائج (Positive, Constructive results) پیدا کرنے والے کام کریں گے۔ جو ایسا نہ کریں گے انھیں بساطِ زندگی سے ہٹا کر الگ کر دیا جائے گا۔

کوئی ہے جو اس پندِ بر دیوار سے نصیحت حاصل کرے؟

اسلامک کانسٹی ٹیوشن

۷ر اکتوبر، قبل دوپہر کا واقعہ ہے۔ بچوں نے دوڑتے ہوئے آکر مجھے اطلاع دی کہ ہمارے مکان سے باہر کوئی راہ رو چلتے چلتے گر پڑا اور بیہوش ہو گیا ہے۔ میں جلدی سے باہر نکلا۔ دیکھا تو ایک نوجوان بیہوش پڑا ہے۔ دو تین راستہ چلنے والے اس کے گرد جمع ہیں اور اس کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے دے رہے ہیں۔ میں نے اس کے منہ میں پانی ڈالا۔ کچھ وقت تک پانی حلق سے نیچے نہ اترا، اس کے بعد پانی اندر گیا تو اس نے بے ساختہ پیٹ پر ہاتھ رکھکر ایک دردناک آہ کھینچی۔ میں نے اس کے پیٹ سے کرتہ ہٹایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس نے پیٹ کو بڑے زور سے کپڑے کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔ میں فوراً بھانپ گیا کہ یہ بیچارہ تو فاقوں کا مارا ہوا ہے۔ جلدی سے گرم گرم دودھ منگایا۔ اس نے دودھ کا پیالہ اس عجلت سے اندر انڈیل لیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت اگر پوری کڑاہی اس کے سامنے ہوتی تو وہ اسے بھی پی جاتا۔ میں نے اسے اٹھا کر بٹھایا اور روٹی منگا کر اس کے سامنے رکھدی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے روٹی توڑ توڑ کر منہ میں ڈالنی شروع کی اور بغیر چبائے نوالے نگلتا چلا گیا۔ میں دم بخود کھڑا ہوا دیکھ رہا تھا کہ بھوک نے اسکا کیا حال کر رکھا ہے۔ جب ایک روٹی باقی رہ گئی تو اس نے اسے لپیٹ لیا۔ میں نے پوچھا کہ تمہارا پیٹ بھر گیا؟ اس نے کہا کہ نہیں، پیٹ تو نہیں بھرا لیکن گھر میں اور لوگ بھی ہیں جو مجھ سے زیادہ بھوکے ہیں۔ میں نے یہ روٹی ان کیلئے رکھ لی ہے۔ ایک بوڑھی ماں، ایک بیوی اور ایک ننھی بچی۔ یہ کہکر وہ بلک بلک کر رونے لگ گیا۔ میں نے اسے تسلی دی اور حالات پوچھنے لگا۔ اس نے کہا کہ وہ مزدور ہے۔ جیل خانے کے پچھلی طرف جھونپڑی میں رہتا ہے۔ چھاؤنی کے اسٹیشن کے قریب ایک ٹھیکیدار ہے۔ اٹھائیس دن تک اسکی مزدوری کی۔ پھر بیمار پڑ گیا اور پندرہ دن ہسپتال میں رہا۔ اس کے بعد اس نے کہا "اب چوتھا روز ہے کہ ہر روز صبح شام ٹھیکیدار کے ہاں جاتا ہوں کہ مزدوری کے پیسے مل جائیں لیکن اس نے کچھ نہیں دیا۔ آج گیا ہوں تو یہ کہہ کر نکال دیا کہ ہم باہر جا رہے ہیں۔ ہفتہ بھر کے بعد آنا۔ وہاں سے نکلا تو دھوپ سخت تھی۔ چار دن سے میرے منہ میں کھیل اڑ کر بھی نہیں پہنچی۔ گھر والے بھی بھوکے ہیں۔ میں نے بھوک کی تکلیف کو کم کرنے کیلئے پیٹ پر کپڑا باندھ رکھا تھا۔ یہاں پہنچا ہوں تو لڑکھڑا کر گر پڑا۔ آپ نے ہمدردی کی تو جان بچ گئی لیکن یہ جان نکل جاتی تو اچھا تھا۔" اب اسکی گھگھی بندھ گئی۔

یہ عین اسوقت ہو رہا تھا جب محترم وزیر اعظم مجلس آئین ساز میں پاکستان کے آئین کا مسودہ پیش کر رہے تھے اور بڑے فخر سے کہہ رہے تھے کہ پاکستان کا آئین کتاب و سنت کے مطابق ہوگا۔ یہ بات فی الواقعہ قابل فخر ہے کہ مسلمانوں کی مملکت کا آئین "کتاب و سنت" کے مطابق ہو لیکن ان مدعیان کتاب و سنت کو کون بتائے کہ کتاب اللہ نے اسلامی مملکت کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ ان لک الا تجوع فیھا ولا تعرٰی۔ وانک لا تظمؤا فیھا ولا تضحٰی (۲۰:۱۱۸-۱۱۹)۔ اس میں نہ کوئی شخص بھوکا ہوگا اور نہ ننگا۔ نہ پیاسا ہوگا اور نہ ہی اسے دھوپ ستائیگی۔ اور سنت رسول اللہ نے ایسی مملکت کو عملاً متشکل کر دیا تھا لہذا جس مملکت میں کوئی ایک فرد بھی بھوکا رہ جائے یا پیاسا۔ یا وہ کپڑے سے محروم رہ جائے یا مکان سے۔ تو اس مملکت کو نہ کتاب اللہ سے کوئی واسطہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی سنت رسول اللہ سے کوئی تعلق۔ واللہ علی ما نقول شہید۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

اکتوبر کا مہینہ اس اعتبار سے بڑا اہم رہا کہ اس میں پاکستان کے لئے آئین سازی کا مسئلہ از سر نو اٹھایا گیا اور ایسی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کے ساتھ کہ اسکی نظیر پہلے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔ اسی ضمن میں ایسے ایسے اہم مسائل اور نکات سامنے آتے رہے جن کے متعلق ضرورت تھی کہ ان کا تجزیہ ساتھ کے ساتھ قرآنی روشنی میں کیا جاتا لیکن طلوع اسلام ایک مہینہ کے بعد شائع ہوتا ہے اسلئے کسی مسئلہ پر مہینہ بھر سے پہلے کچھ شائع کرنا ہمارے بس ہی میں نہیں۔ اسی اہمیت اور ضرورت کے پیش نظر ہم نے دوسرے مقام پر اپیل کی ہے کہ طلوع اسلام کو کم از کم ہفتہ وار کر دیا جائے۔ دیکھیں اس اپیل کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی دوسری رپورٹ کی جس شق پر مسئلہ آئین سازی میں تعطل ہو چکا تھا محترم وزیر اعظم نے از سر نو اس شق کو لیا اور ایک ایسا فارمولا پیش کر دیا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ متفق علیہ ہے۔ جہاں یہ امر موجب اطمینان ہے کہ کوئی ایسا فارمولا وضع ہوا جو سب کے نزدیک قابل قبول ہے وہاں یہ چیز افسوسناک بھی ہے کہ سب کے نزدیک قابل قبول ایسا فارمولا قرار پا جائے جس سے ملک ٹکڑوں میں بٹ گیا اور باہمی بعد و مغایرت کے اسباب و امکانات زیادہ ہو گئے۔ قرآنی نقطۂ نگاہ سے دنیا کے مختلف گوشوں میں بسنے والے تمام مسلمان ایک ملت کے افراد ہیں، لیکن اگر اس عالمگیر وحدت کو سردست سمٹا کر کسی ایک مملکت تک ہی محدود کیا جائے تو اس مملکت کے اندر بسنے والے تمام مسلمانوں کو تو ایک ملت ہونا چاہیئے، لیکن اس فارمولا کی رو سے پہلے ملت کو مشرق و مغرب میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان کے درمیان ایک ناقابل عبور خلیج حائل کر دی گئی ہے اور اس کے بعد مغربی پاکستان کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے اس بازو کی وحدت کو بھی ختم کر دیا گیا ہے۔ اس فارمولا سے اس امر کا تو عملاً اعتراف کر لیا گیا کہ پاکستان کے اندر بسنے والے مسلمان ایک قوم نہیں بن سکے۔ اس اعتراف کے بعد وہ صورت زیادہ بہتر تھی جسے ہم نے سابقہ اشاعت میں پیش کیا تھا۔ یعنی مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کو دو الگ الگ وحدتیں قرار دیکر ان میں کانفڈریسی قائم کر دی جائے لیکن اس فارمولا کی رو سے یہ بھی نہ ہوا۔ ذرا صورت حالات پر غور کیجئے۔ ملک کے اکتیس علماء حضرات جمع ہوئے تو انھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ ملت کے مسلمہ فرقوں کے وجود کو آئینی طور پر تسلیم کیا جائے۔ اور دوسری طرف ارباب سیاست کا اتفاق ہوا تو اس امر پر کہ ملک کے ان خطوں کو جنھیں انگریز نے اپنی حکمت عملی کے لئے تراشا تھا آئین کی رو سے مستقل حیثیت دیدی جائے۔ ملت کی وحدت نہ ان کے پیش نظر تھی، نہ ان کے سامنے۔ اور طرفہ تماشا یہ کہ وہ بھی آئین کی بناء قرآن و سنت قرار دیتے تھے اور یہ بھی بار بار قرآن و سنت کو دہرا رہے ہیں۔ حالانکہ قرآن اور سنت دونوں امت کی وحدت کو دین کی اصل قرار دیتے ہیں اور فرقہ بندی کو (خواہ وہ مذہبی ہو یا سیاسی)

شرک ٹھہراتے ہیں۔

اگر اس فارمولا کو صرف علمی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو بھی اس میں بڑے اسقام نظر آتے ہیں لیکن ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس فارمولا پر اتفاق کے بعد آئین سازی کے باب میں جو بحث آگے چلی اس میں قابل ذکر امور کیا کیا ہیں۔

یہ امر موجب اطمینان ہے کہ اس بات پر سب کم و بیش متفق ہو رہے ہیں کہ ہمارے ملاؤں نے قانون کو اپنے تابع رکھنے کے لئے جو شور اٹھایا تھا اس سے متاثر نہ ہوا جائے۔ چنانچہ اب قریب قریب ہر ممبر علماء بورڈ کے خلاف ہے اور اسے رجعت پسند اقدام قرار دیتا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔ بطور ستائش خویش نہیں بلکہ بطور تحدیث نعمت لکھا جاتا ہے کہ اس باب میں طلوعِ اسلام نے جو اپنی ننھی سی آواز اٹھائی تھی اللہ نے اسے کافی قوت عطا کر دی اور اب ملک کے گوشہ گوشہ سے یہ آواز آرہی ہے کہ امت کو ملا ازم کے خطرناک چنگل سے بچا لینا چاہئے۔ ملا ازم کی مخالفت میں طلوعِ اسلام کا کوئی ذاتی مفاد نہیں۔ اس کی مخالفت کی صرف ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ اس کے نزدیک ملائیت کا تصور یکسر غیر قرآنی اور عجمی اسلام کی پیداوار ہے۔ اور ملا ازم نے جس قدر نقصان امت کو پہنچایا ہے اس پر تاریخ کے خونیں اوراق شاہد ہیں۔ اسلئے طلوعِ اسلام اپنے دعوت الی القرآن اور تحفظ مفاد ملت کے تقاضوں سے مجبور ہے کہ ملت کو اتنے مہیب خطرہ سے آگاہ کرے اور اس کے سدباب کے لئے اپنے امکان بھر کوشش کرے۔

طلوعِ اسلام کو اس پر بھی فخر ہے کہ اس نے ملا ازم کی اس طرح مخالفت نہیں کی جس طرح ترکی میں ہوئی تھی۔ مصطفیٰ کمال ملا ازم کے خطرات سے تو پوری پوری طرح آگاہ ہو گیا لیکن اسے یہ بتانے والا کوئی نہ ملا کہ ملا ازم کو ختم کر کے معاشرہ کو خالص قرآن کے خطوط پر متشکل کرنا چاہئے۔ یہی خدا کا دین ہے جسے اس نے ہمارے لئے پسند کیا ہے اور جس کی رو سے ہم دنیا میں ایک الگ ملت بنتے ہیں۔ چونکہ وہ خود اس حقیقت سے آشنا نہیں تھا اور نہ ہی اسے اس حقیقت کو بتانے والا کوئی ملا۔ اس لئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ملا ازم کے لبادہ کو اتار کر پھینکا تو اس کے ساتھ ہی قرآن بھی باہر جا پڑا۔ طلوعِ اسلام کی طرف سے عجمی اسلام کے ختم کرنے کی جو تحریک پیش کی جارہی ہے وہ اس لئے ہے کہ معاشرہ کو از سرِ نو قرآنی خطوط پر متشکل کیا جائے۔ لہٰذا طلوعِ اسلام کے نزدیک اگر ملا کی مخالفت ضروری ہے تو اس کے ساتھ ہی ہر اس آواز کی مخالفت بھی اشد ضروری ہے جو کسی صورت میں بھی قرآن کے اثر کو کم کرنے والی ہو۔ مسلمان کی زندگی دین کے لئے ہے اور اس کی موت بھی دین کی خاطر ہے۔ لہٰذا کوئی آواز جو اسے دین سے بیگانہ بنا دینے کیلئے اٹھے دبا دینے کے قابل ہے خواہ وہ کسی گلے سے کیوں نہ نکلے۔

یہ چیز بھی تعجب انگیز ہے کہ ملا ازم کی مخالفت کرنے والوں میں بھی اکثر ایسے لوگ ہیں جنھیں پتہ نہیں کہ ملا ازم کہتے کس کو ہیں؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ملا ازم کی مخالفت کرتے ہیں اور ان تمام عناصر کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنا چاہتے ہیں جن سے ملا ازم ترتیب پاتی ہے اگر آپ فقہ اور روایات کو دین کے اجزا قرار دیدیں تو پھر ملا ازم کسی طرح مٹ ہی نہیں سکتا۔ یہی تو وہ ستون ہیں جن پر ملا ازم کی پوری عمارت قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملا ان لوگوں کی مخالفت سے کچھ زیادہ خائف نہیں (وہ خائف ہے تو صرف

طلوعِ اسلام کی مخالفت سے، اسلئے کہ وہ جانتا ہے کہ طلوعِ اسلام اس اصل و بنیاد کو کاٹتا ہے جس سے ملاازم کے شگوفے پھوٹتے ہیں اور یہ دوسرے لوگ ملاازم کی مخالفت بطور فیشن کرتے ہیں اور اس جڑ اور بنیاد کو علیٰ حالہ قائم رکھتے ہیں جس پر ملاازم متفرع ہے۔ ملّا نے اسی مقصد کے لئے سنت اور روایات کو مرادف قرار دے رکھا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ جب یہ چیز پاکستان کے آئین کی بنیاد میں رکھدی گئی ہے کہ ملک کا کوئی قانون "کتاب و سنت" کے خلاف نہیں بنایا جائے گا تو ملک کو قدم قدم پر روایات سے سابقہ پڑے گا اور روایات اور ملاازم ایک ہی سکہ کے دو رخ ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ابھی ملک کی سمجھ میں نہیں آرہی۔ وقت آنے پر یہ خود سمجھ جائیں گے۔ اسوقت ہمارے لئے یہ احساس ایک گونہ اطمینان کا موجب ہے کہ اس امر کی تحقیق کے لئے کہ فلاں قانون کتاب و سنت کے خلاف ہے یا نہیں عدالتِ عالیہ کی طرف رجوع کیا جائے گا، عدالتِ عالیہ کے جج قانونی شعور (Sense of Law) اور علم و بصیرت سے مسئلہ زیرِ نظر پر غور کرینگے اور قرآن کا یہ دعویٰ ہے کہ جب بھی کسی معاملہ پر علم و بصیرت اور قانونی شعور کی رو سے غور کیا جائے گا تو قرآن ہمیشہ غالب رہیگا۔

ایک دوسری چیز جو قابلِ ذکر ہے وہ مجلس آئین ساز کے ممبر پروفیسر چکراورتی کے وہ اعتراضات ہیں جو انھوں نے اسلام کے خلاف کئے۔ ہماری سب سے بڑی اور بنیادی بدبختی ملاحظہ کیجئے کہ ایک طرف ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارا آئین کتاب و سنت پر مبنی ہوگا اور اس حقیقت کو خود مجلس آئین ساز تسلیم کرچکی ہے جب اس نے قراردادِ مقاصد کو منظور کرلیا اور دوسری طرف اس مجلس میں جس نے ہمارا آئین بنانا ہے غیر مسلم اراکین بھی شریک ہیں۔ اگر غیر مسلم اراکین کتاب و سنت کی صداقت، محکمیت، عالمگیریت اور ابدیت کے قائل ہوتے تو وہ غیر مسلم کیوں رہتے۔ ان کا غیر مسلم ہونا ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ ان حقائق کو تسلیم نہیں کرتے۔ ہم انھیں مجبور نہیں کرتے کہ وہ ان حقائق کو ضرور تسلیم کریں لیکن یہ تو واضح ہے کہ جو شخص ان حقائق کو تسلیم نہیں کرتا وہ ان کے مطابق آئین بنانے کے موافق کس طرح ہوسکتا ہے۔ یہ ہے وہ بنیادی سبب جس کی بناپر پروفیسر چکرورتی نے بھرے مجمع میں یہ کہا کہ قرآن کے مطابق آئین بنانے کے معنی یہ ہیں کہ اس بیسویں صدی میں چھٹی صدی عیسوی کے قوانین کو رائج کیا جائے اور اس طرح پاکستان کے باشندوں کو عصرِ حاضر سے پیچھے لوٹا کر ازمنۂ متوسطہ میں لیجایا جائے۔ ہم پروفیسر چکرورتی سے اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ آج بھی دنیا کس طرح اس نظام کے لئے تڑپ رہی ہے جسے ازمنۂ متوسطہ میں قرآن نے پیش کیا تھا۔ ہم ان سے صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے تشکیل پاکستان کیلئے جدوجہد ہی اس لئے کی تھی کہ وہ اپنی زندگی کو اس دین کے قالب میں ڈھال لیں جسے وہ انسانیت کے قامت کے لئے بہترین قالب تصور کرتے ہیں۔ اور یہ تصور اُن کا ایمان ہے۔ ہم نے پاکستان حاصل ہی اس لئے کیا تھا کہ ہم یہاں اس آئین کو رائج کریں جو ہمیں ازمنۂ متوسطہ میں ملا تھا اور جس کا بقاء اور تحفظ ہماری زندگی کا مقصد ہے۔ لہٰذا جب پاکستان کے وجود کی غایت ہی یہ تھی تو آج کسی کو یہ کہنے کا کیا حق حاصل ہے کہ ہم اس غایت کو اپنی زندگی کا مقصود کیوں بنا رہے ہیں۔ ہم نے آزادی حاصل کی ہے اور

آزادی کے معنی یہ ہیں کہ ہم جس آئین کو اپنے لئے بہترین سمجھیں اسے اختیار کرلیں۔ اگر آج انگریز ہندوستانیوں سے یہ کہدے کہ تم نے اشوک کے چکر کو مملکت کی علامت کیوں قرار دیا تو اس کا صاف جواب یہی ہوگا کہ ہم نے آزادی ہی اسیئے حاصل کی تھی۔ پاکستان کی غیر مسلم آبادی کو اعتراض کا حق اس وقت حاصل ہے جب وہ یہ دیکھے کہ یہاں کوئی قانون ایسا رائج ہوا ہے جس سے ان پر ظلم اور زیادتی ہوتی ہے۔ انھیں اس پر اعتراض کا کوئی حق نہیں کہ یہاں مسلمان اپنے لئے کونسا قانون بناتے ہیں۔

لیکن اس میں پروفیسر چکرورتی کا بھی کوئی قصور نہیں۔ قصور خود ہمارا اپنا ہے جنھوں نے اپنے بنیادی دعاوی کے خلاف پاکستان کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم قرار دے رکھا ہے۔ خود مجلس آئین ساز میں غیر مسلموں کو پاکستان کی قوم کے افراد کی حیثیت سے شریک کر رکھا ہے۔ جب اس مجلس میں کوئی مسئلہ پیش ہوگا تو مجلس کے ہر رکن کو حق حاصل ہوگا کہ وہ اس کے متعلق اظہار خیال کرے۔ یہ تھی وہ بنیادی حقیقت جس کے لئے قرآن نے یہ کہا تھا کہ مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے فرد نہیں بن سکتے۔ (اور جس کی بنا پر ہم نے پاکستان کے دعوے کی بنیاد رکھی تھی) اور یہ کہ مسلمانوں کے امور مملکت کے فیصلے ان کے اپنے باہمی مشوروں سے طے ہوں گے۔ وامرھم شوریٰ بینھم میں بینھم کی تخصیص بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ مثلاً ہماری مجلس قانون ساز میں کسی مسئلہ کے متعلق کوئی قانون پیش ہوا اور سوال زیر بحث ہو کہ قرآن وسنت کے مطابق اس مسئلہ کی کیا پوزیشن ہے تو اس کے لئے ہمیں ایک غیر مسلم کیا مشورہ دیگا اور ہمارے نزدیک اس کے مشورہ کی حیثیت کیا ہوگی۔ ایک مسلمان مملکت میں غیر مسلموں کے نمائندے غیر مسلموں کی ترجمانی کیلئے ہوتے ہیں نہ کہ مسلمانوں کی ترجمانی کے لئے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کی تصریح ہمارے آئین میں نہایت ضروری ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ نہ تو مجلس آئین ساز کے کسی رکن نے اور نہ ہی حکومت کے نمائندوں میں سے کسی نے پروفیسر چکرورتی کے جواب میں اس نکتہ کی وضاحت کی۔

ہم یہاں اس مسئلہ پر محض اصولی گفتگو کر رہے ہیں۔ اس پر تفصیلی اور جزئی بحث اسوقت ہوسکے گی جب یہ مسئلہ زیر بحث ہوگا کہ پاکستان کی مجلس قانون ساز میں غیر مسلم جماعتوں کے نمائندوں کی پوزیشن کیا ہوگی۔ یہ مسئلہ بڑا اہم ہے اور مجلس آئین ساز کو اس کے متعلق جلد از جلد ضروری فیصلہ کرلینا چاہیئے۔ اور اس فیصلہ کو آئین کے اندر داخل کردینا چاہیئے۔

یہ مسئلہ بھی زیر غور رہا کہ صدر مملکت مسلمان ہونا چاہیئے۔ ذرا سوچئے کہ بھلا یہ سوال بھی ایسا تھا جس پر کسی بحث و تمحیص کی ضرورت تھی۔ اگر مسلمانوں کی مملکت کا صدر مسلمان نہیں ہوگا تو اور کون ہوگا۔ لیکن مخالفین کو تو چھوڑیئے موافقین کی محجوبیت کا بھی یہ عالم رہا کہ وہ یہ منطقی دلیل پیش کرتے رہے کہ چونکہ یہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے اس لئے یہ عملاً ناممکن ہوگا کہ کوئی غیر مسلم صدر مملکت بن سکے۔ حالانکہ کہنے کی بات صرف اتنی تھی کہ مسلمانوں کی مملکت کا صدر غیر مسلم ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن آپ غور سے دیکھئے کہ یہاں بھی تحت الشعور میں وہی تصور کار فرما ہے کہ پاکستان میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک ہی

نیشن (NATION) کے افراد ہیں، جب تک یہ تصور صاف نہیں ہوتا ہمارا کوئی مسئلہ بھی صاف نہیں ہو سکے گا۔

اس کے بعد ایک ایسا مسئلہ زیر بحث رہا جسے دیکھکر ہمیں ہنسی بھی آتی تھی اور رنج بھی ہوتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ پاکستان کی اسٹیٹ کا مذہب کیا ہوگا (اس مسئلہ کے حل کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی اور ان الفاظ کی تحریر کے وقت تک اس کمیٹی کی سفارش ہمارے سامنے نہیں آئی) اگر یہ بات محض "ارباب سیاست" تک ہی محدود رہتی تو بھی یہ چیز "ابل فہم تھی۔ لیکن افسوس اسوقت ہوا جب ارباب مذہب کے ترجمان سید سلیمان ندوی نے بھی یہ بیان شائع فرمادیا کہ پاکستان اسٹیٹ کا مذہب اسلام ہونا چاہیئے ـــــ خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے۔

ذرا غور کیجئے کہ اسٹیٹ کہتے کسے ہیں۔ اسٹیٹ ایک سیاسی تصور ہے یا زیادہ سے زیادہ ایک اجتماعی ادارہ (Organization) یا (Association)۔ ان حضرات سے پوچھئے کہ کیا کسی آرگنائزیشن کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے؟ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہماری کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کا مذہب کیا ہے؟ یا ہماری گورنمنٹ کا مذہب کیا ہے؟ آپ تو کہہ سکتے ہیں کہ کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی کے ممبران کا یہ مذہب ہے یا یہ مذہب ہونا چاہیئے۔ یا گورنمنٹ کے ارکان کا یہ مذہب ہے یا یہ مذہب ہونا چاہیئے۔ مذہب ہمیشہ افراد کا ہوتا ہے۔ تصورات یا آرگنائزیشنز کا مذہب نہیں ہوا کرتا۔ اگر یہ کہنے سے کہ پاکستان کی اسٹیٹ کا مذہب اسلام ہوگا آپکا مطلب یہ ہے کہ یہاں کے باشندوں کا مذہب اسلام ہوگا، تو اس کے لئے ضروری ہے کہ یہاں کے تمام غیر مسلم باشندوں کو یا مسلمان بنالیا جاوے یا انھیں یہاں سے نکال دیا جائے۔ ورنہ اگر یہاں کا ایک باشندہ بھی غیر مسلم ہوا تو اس اسٹیٹ کا مذہب اسلام نہیں رہے گا۔ یہیں سے ایک دلچسپ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی وقت کوئی ایسی بات ہوگئی جس سے علماء حضرات نے کہدیا کہ اسٹیٹ کا مذہب اسلام نہیں رہا تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اسٹیٹ مرتد ہوجائے گی اور علماء حضرات کے نزدیک مرتد کی سزا قتل ہے تو فرمائیے کہ اس وقت پھانسی پر کسے چڑھایا جائے گا۔ کیا ساری کی ساری اسٹیٹ کو یا کسی فرد کو۔

آپ نے غور کیا کہ یہ سوال ہی کتنا مضحکہ انگیز ہے کہ اسٹیٹ کا بھی کوئی مذہب ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہیگل نے یہ تصور دیا کہ اسٹیٹ اپنا جداگانہ تشخص رکھتی ہے۔ وہ ذی روح ہوتی ہے۔ اسکی اپنی ذات (Personality) ہوتی ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر (Bosanquet) نے اس تصور سے منطقی نتائج مرتب کئے اور فاشزم اور نازی ازم نے ان نتائج کو اپنے لئے مفید مطلب پاکر اسٹیٹ کو بت بنادیا اور افراد مملکت پر اس کی پرستش فرض قرار دیدی۔ اس طرح سے اسٹیٹ کے تشخص کا تصور پیدا ہوا۔ اب ہمارے ارباب سیاست اور ارکان مذہب ہیں کہ اسی تصور سے متاثر ہوکر یہ سوال لے بیٹھے ہیں کہ اسٹیٹ کا مذہب بھی ہونا چاہیئے۔ اور اس کی تائید میں یہ کہا جاتا ہے کہ ایران کی کانسٹی ٹیوشن میں یہ ہے کہ اسٹیٹ کا مذہب اسلام ہوگا۔ کیسی محکم ہے یہ دلیل؟

سید صاحب نے لکھا ہے کہ پاکستان اسٹیٹ کا مذہب اسلام قرار دیا جانا اسلئے ضروری ہے کہ

اس سے سیکولرازم، کمیونزم، اتھی ازم اور میٹیریلزم وغیرہ مسالک کا پروپیگنڈا روک دیا جائے گا۔ اسلئے کہ اس پروپیگنڈے کو پاکستان کے خلاف بغاوت قرار دیا جائے گا۔ غیر اسلامی اور غیر پاکستانی سرگرمیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں۔

یہ مقاصد تو بڑے نیک ہیں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آسکا کہ اسٹیٹ کا مذہب اسلام قرار دینے سے یہ چیزیں کس طرح سے رک جائینگی۔ ایران نے اسٹیٹ کا مذہب اسلام قرار دے رکھا ہے۔ کیا وہاں یہ چیزیں رک گئی ہیں۔ اگر آپ ان تصورات کی تبلیغ کو بغاوت قرار دینا چاہتے ہیں تو اس قسم کا قانون بنایئے ورنہ اگر مملکت کا مذہب اسلام ہونے کے معنی یہ ہوں گے کہ اس میں اسلام کے سوا ہر عقیدہ اور ہر تصورِ حیات کی تبلیغ بغاوت خیال کی جائے گی تو اس کا دائرہ صرف کمیونزم، میٹیریلزم تک ہی محدود نہیں رہے گا۔ اس صورت میں کوئی غیر مسلم (ہندو، عیسائی، پارسی) اپنے مذہب کی تبلیغ نہیں کر سکے گا۔ بلکہ وہ غیر مسلم رہ بھی نہیں سکے گا۔ اس لئے کہ غیر مسلم رہتے ہوئے اسے اپنے مذہب کے عقائد اور رسوم وغیرہ کو ادا کرنا ہوگا اور یہ چیزیں مملکت کے خلاف بغاوت ہوں گی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ آپ کسی عقیدہ کی تبلیغ کو تو جرم قرار دیں اور اس پر عمل کرنا جرم قرار نہ دیں۔ مثلاً آپ کمیونزم کی تبلیغ کو تو جرم قرار دیں اور اگر کمیونسٹ پاکستان میں کمیونزم کا نظام عملاً قائم کریں تو وہ جرم قرار نہ پائے۔

بات بالکل سیدھی سی ہے، جب یہ چیز ہمارے آئین کے اندر داخل ہو چکی ہے کہ پاکستان کا آئین کتاب و سنت پر مبنی ہوگا۔ اور اس میں کوئی قانون ایسا پاس نہیں کیا جائے گا جو کتاب و سنت کے منافی ہو تو اس سے زیادہ اور کس چیز کی ضرورت ہے۔ اصل یہ ہے کہ ان حضرات نے اس سے پہلے آئین سازی کے متعلق کبھی سوچا نہیں، نہ ہی اس کے لئے ان کی اُن کتابوں میں کچھ موجود ہے جو اندھے کی لکڑی کی طرح ان کے کام آتی ہیں۔ لیکن زمانہ کے تقاضہ سے یہ لوگ ظاہر یہ کرنا چاہتے ہیں کہ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ اس قسم کی بوکھلاہٹ اور پریشانی فکر و نظر ہے۔ اسی پریشانی کی ایک اور مثال محترم راغب احسن صاحب کے ایک بیان میں ملتی ہے جس میں انھوں نے (اس پر زور دینے کے بعد کہ اسٹیٹ کا مذہب اسلام ہونا چاہئے) یہ بیان فرمایا ہے کہ

> اسلامی جمہوریہ میں حقیقی (SOVEREIGN) خدا کی ذات ہوتی ہے۔ خدا کا رسول (صلعم) مملکت کا زندہ رئیس ہوتا ہے اور امت کا منتخب کردہ خلیفہ یا امیر جو صرف برائے نام رئیس مملکت ہوتا ہے وہ رسول کا نائب ہوتا ہے۔ جس طرح حضرت ابوبکرؓ نے اپنے آپ کو خلیفۃ الرسول کہہ کر اپنی اس پوزیشن کو متعین کر دیا ہے۔ وہ اخلاقی اور روحانی طور پر اللہ اور رسول کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے اور سیاسی طور پر امت کے سامنے جوابدہ۔
>
> (ڈان ۱۹ر اکتوبر ۱۹۵۳ء)

سوائے اس کے کہ اس پر دین ماتم کرے، علم روئے اور دنیا ہنسے اس "شاعری" کے متعلق اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ حضرت خیر سے ایم۔ اے بھی ہیں۔ اے کاش ان حضرات کو کہیں یہ توفیق نصیب ہو جاتی کہ یہ اپنے رسمی تخیلات کے آسمانوں سے زمین پر اُتر آتے اور یہاں خدا کی کتابِ زندہ کی روشنی میں انسانی معاملات کا حل سوچتے۔

بہر حال یہ ہیں آئین سازی کے سلسلہ میں اسوقت تک کی کوششیں۔ خدا کرے کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اسوقت مملکت کا مستقبل ہے وہ اپنے فرائض کا کماحقہ احساس کریں اور قرآن کی روشنی میں علم و بصیرت سے کام لیکر اور دوسرے تمام رجحانات اور میلانات کو الگ رکھکر ملت کے لئے ایسا آئین مرتب کر دیں جس سے اسے انسانیت کی قامت نصیب ہو جائے۔

حساب کی غلطی

دفتر طلوع اسلام سے کاروباری معاملہ میں اگر آپ کو کہیں حساب کی غلطی محسوس ہو تو اس سے غصے میں نہ آجایئے۔ حساب فہمی کے لئے کارڈ لکھ دیجئے۔ اس طرح معاملہ صاف ہو جائیگا۔ جس طرح حساب کتاب میں بعض اوقات آپ سے غلطی ہو جاتی ہے اسی طرح دفتر طلوع اسلام کے کارکنوں سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ حساب فہمی کیلئے آپ کا تعاون ہمارے لئے شکریہ کا موجب ہوگا۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کراچی

دیکھئے۔ اپنا خریداری نمبر تلاش کیجئے

نومبر ۱۹۵۳ء کی اس اشاعت کے ساتھ آپ حضرات کا چندہ (جن کے نمبر خریداری درج ذیل ہیں) ختم ہو گیا ہے۔ لہذا آئندہ ماہ دسمبر ۱۹۵۳ء کا پرچہ آپ کی خدمت میں وی پی بھیجا جائے گا۔ اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو ۲۰ نومبر ۱۹۵۳ء سے پہلے پہلے آپ اپنا چندہ بذریعہ منی آرڈر ارسال فرما دیں کہ اس میں ادارہ کو سہولت اور آپ کو کفایت ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے خدانخواستہ آپ رسالہ کی خریداری آئندہ جاری رکھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں تو ۲۰ نومبر سے پہلے ادارہ کو اپنے اس فیصلہ سے مطلع فرما دیں ورنہ ادارہ کی طرف سے مرسلہ وی پی کو وصول فرمانا آپ کا اخلاقی فریضہ ہوگا۔

فہرست خریداران جن کا چندہ ختم ہوگیا ھے

۱۱۴۳ — ۱۱۵۵ — ۱۱۵۷ — ۱۱۵۸ — ۱۱۵۹ — ۱۱۶۴ — ۱۱۶۵ — ۱۱۶۶ — ۱۱۶۸ — ۱۱۷۱ — ۱۱۷۲ —

۱۱۷۴ — ۱۱۷۵ — ۱۱۸۱ — ۱۱۸۲ — ۱۱۸۳ — ۱۱۸۴ — ۱۱۸۵ — ۱۱۸۶ — ۱۱۸۷ — ۱۱۹۰ —

ہفتہ وار طلوع اسلام

قارئینِ طلوعِ اسلام میں سے ایک صاحبِ بصیرت اور دردمند دوست رقمطراز ہیں:۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ یہ امر موجب ہزار برکت وسعادت ہے کہ تیرہ سو سال کے بعد پھر سے خالص قرآن کی آواز طلوعِ اسلام کی وساطت سے بلند ہونی شروع ہوئی۔ طلوعِ اسلام اپنی اس سعادت پر جسقدر بھی فخر کرے کم ہے۔ لیکن زمانہ جس تیز رفتاری کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اس کے پیشِ نظر اسکی اشاعت میں ایک ماہ کا وقفہ ناقابلِ برداشت ہے۔ قدم قدم پر ایسے حالات سامنے آتے ہیں جب ہماری نگاہیں یہ دیکھنے کے لئے آسمان کی طرف اٹھ جاتی ہیں کہ ان کی بابت کتاب اللہ کیا راہنمائی ملتی ہے۔ آجکل مجلس آئین ساز میں پھر سے آئین سازی کے مسائل پر غور ہو رہا ہے۔ ان میں سے ایک ایک مسئلہ ایسا ہے جس کے متعلق قرآن کی روشنی میں غور کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے بعد ملک کے قوانین کی ترمیم وترتیب کام جلد سامنے آجائیگا۔ اسوقت بھی ایک ایک قدم پر یہ سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت پڑے گی کہ فلاں معاملہ میں قرآن کا کیا فیصلہ ہے۔ ملکی مسائل کے علاوہ بین الاقوامی معاملات بھی اس تیزی سے سامنے آرہے ہیں کہ ان کی افہام وتفہیم کیلئے قرآنی روشنی کا اسی تیزی سے سامنے آتے رہنا نہایت ضروری ہے۔ ویسے بھی یہ دور جمہوریت کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ہمیں یہاں قرآنی نظام کو رائج کرانا ہے تو اس کے لئے یہاں کی اکثریت کو اپنے ہم نوا کرنا ہوگا اور یہ ہو نہیں سکتا جب تک ہم قرآن کی آواز کو زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر عام نہ کردیں۔ ان حالات کے پیشِ نظر ضرورت ہے اور اشد ضرورت، کہ طلوعِ اسلام اگر روزانہ شائع نہیں ہوسکتا تو کم ازکم ہفتہ وار ہی ہوجائے اور اگر دنیا کی زیادہ زبانوں میں نہیں تو کم ازکم اردو اور انگریزی ہی میں اس کی اشاعت ہو۔ کیا آپ کے پیشِ نظر اس کے لئے کوئی عملی اسکیم نہیں؟ خدا کے لئے اس میں تاخیر نہ کیجئے۔ زمانہ بڑا نازک اور وقت بہت کم ہے۔ اسلئے جو کچھ کیجئے جلدی کیجئے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ ملک میں روز نئے نئے اخبارات کا اضافہ ہوتا جارہا ہے وہ بالآخر لوگوں ہی کی مدد سے نکلتے اور چلتے ہیں۔ کیا قرآن کی آواز بلند کرنے والوں کو دس بیس افراد بھی ایسے نہیں مل سکتے جو دو ہفتہ وار اخبار (ایک اردو اور ایک انگریزی میں) چلانے کے لئے امداد دے سکیں؟ کیا "نجد" بالکل ویرانہ ہوچکا ہے؟

ہم اس "درماندہ راہی کی صدائے دردناک" پر ایک لفظ کا اضافہ کئے بغیر اسے اعرض کردینا کافی سمجھتے ہیں کہ طلوعِ اسلام تو اپنے خونِ جگر کا ایک ایک قطرہ، ودیعتِ مژگانِ یار کئے بیٹھا ہے لیکن اس کا کیا علاج کہ اس دور میں خالی خونِ جگر سے کام نہیں چلتا۔ طلوعِ اسلام کو (ایک روزنامہ نہیں تو کم ازکم) ہفتہ وار کردینے (اور اس کے اردو، انگریزی اور عربی

ایڈیشن نکالنے) کی آرزوئیں ایک عرصے سے ہمارے دل میں مچل رہی ہیں۔ لیکن آجتک اس کی ماہوار اشاعت کا خرچ بھی پورا نہیں ہوسکا، چہ جائیکہ اسے ہفتہ وار نکالنے کا سامان میسر آسکے۔ اگر (سو سو روپے والے) معاونین کی اسکیم خاطر خواہ طور پر کامیاب ہوجاتی تو بھی اس کی گنجائش نکل آتی۔ لیکن وہ اسکیم طلوعِ اسلام کی کتابیں شائع کرنے کے لئے بھی کافی نہیں ہوسکی۔
اس میں شبہ نہیں کہ دوسرے اخباروں کے اجراء اور اشاعت کے لئے لوگ لاکھوں روپے دیدیتے ہیں۔ لیکن یہ اس لئے کہ ان اخبارات سے ان کے ذاتی مفاد وابستہ ہوتے ہیں اور اخبار کے زور پر ان کے کئی کام نکلتے ہیں۔ لیکن قرآن کی آواز کو بلند کرنے کے لئے تو وہی آگے بڑھ سکے گا جس کے دل میں ذاتی مفاد کے مقابلے میں انسانیت کے مفاد کا جذبہ موجزن ہو اور وہ خدا کا قانون بلند کرنے کے لئے اپنے مفاد کی کوئی پرواہ نہ کرے۔ اس "سوداگروں کی دنیا" میں اس قسم کا سودا کرنے والے بہت کم ملیں گے۔

ہمارا اندازہ یہ ہے کہ طلوعِ اسلام کو ہفتہ وار (صرف اردو میں) شائع کرنے کے لئے کم از کم دس ہزار روپیہ درکار ہے۔ آجکل کے زمانے میں یہ ایک ایسی قلیل رقم ہے جسے کوئی شخص تنہا اٹھا کر ادا کرسکتا ہے۔ لیکن اگر اس حلقہ میں کوئی ایک آدمی ایسا صاحب ہمت نہیں تو اس رقم کو دس حضرات ایک ایک ہزار روپیہ ادا کر کے پورا کرسکتے ہیں۔ طلوعِ اسلام نے آجتک کبھی عطیہ کے لئے اپنا دامن نہیں پھیلایا۔ (معاونین کی اسکیم کاروباری اسکیم ہے۔ اس میں ہم نے عطیہ کی شکل نہیں رکھی) لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ وقت کا تقاضا ایسا شدید ہے جس کے پیش نظر ہمیں اپنی اس "وضعداری" کو بھی چھوڑنا ہوگا۔

لہٰذا:-

(۱) اگر آپ اس سے متفق ہیں کہ طلوعِ اسلام کو ہفتہ وار ضرور ہونا چاہئے۔ اور

(۲) آپ میں اتنی استطاعت ہے کہ اس مقصد کے لئے آپ ہماری امداد کرسکیں تو براہ کرم ہمیں مطلع فرمائیے کہ آپ اس کام میں کس حد تک حصہ لے سکتے ہیں۔ سردست روپیہ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنی اطلاع دینے کی ضرورت ہے کہ آپ عند الطلب اسقدر رقم بطور عطیہ دے سکیں گے۔ واضح رہے کہ

(۱) ہماری یہ اپیل ان حضرات سے بالکل نہیں جو اپنے پہلو میں دلِ درد مند ضرور رکھتے ہیں لیکن جنہیں ایسے کاموں میں حصہ لینے کے لئے اپنے یا اپنے بچوں کا پیٹ کاٹنا پڑتا ہے۔

(۲) نہ ہی یہ اپیل ان حضرات سے ہے جو اپنے عطیوں کو ایسی شرائط سے مشروط کرنا چاہیں جو طلوعِ اسلام کی حق گوئی کی راہ میں مانع ہوجائیں۔ عطیہ بلا مشروط ہونا چاہئے۔

آپ کا جواب بیس نومبر تک ہمارے پاس پہنچ جانا چاہئے۔ والسلام

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام۔ کوی روڈ۔ (صدر) کراچی۔

ذوقِ نظر

اس ماہ ایک ایسی خبر وجہ شادابیٔ نگاہ اور باعث شگفتگیٔ قلب ہوئی جس کی موجودہ فضا میں بالکل توقع ہی نہ تھی۔ خبر یہ ہے کہ مرکزی حکومت پاکستان نے مصورِ مشرق عبدالرحمٰن صاحب چغتائی کیلئے پانصد روپیہ ماہوار کا وظیفہ تا زیست منظور کیا ہے ہمیں اس باب میں نہ تو محترم چغتائی صاحب کے آرٹ کے متعلق کچھ عرض کرنے کی ضرورت ہے (اسلئے کہ وہ اس مقام تک پہنچ چکے ہیں جہاں آرٹ تحسین و آفریں کے سہاروں سے بے نیاز ہو جایا کرتا ہے) اور نہ ہی اس وظیفہ کی کمیت کے متعلق کچھ کہنے کی حاجت (اسلئے کہ اعترافِ حسن کی قدر و قیمت چاندی سونے سے نہیں ناپی جاسکتی)۔ ہمیں جو کچھ کہنا ہے وہ صرف یہ ہے کہ یہ امرِ فی الواقعہ بڑی خوشی کا موجب ہے کہ ہماری حکومت کو اس کا احساس تو ہوا کہ قوم کی زندگی میں آرٹ بھی اپنی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی حوصلہ افزائی کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم حکومت پاکستان کو درخورِ تبریک سمجھتے ہیں کہ اس نے فن کے اعتراف سے اپنے حسنِ ذوق کا ثبوت دیا۔ یہ وظیفہ جناب چغتائی کیلئے نہیں بلکہ ہمارے اربابِ حل و عقد کیلئے موجبِ فخر و مباہات ہے۔ غالبؔ کے الفاظ میں

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ معلوم کر کے افسوس ہوا کہ جناب چغتائی نے پیامِ اقبالؔ کو اپنے خونِ جگر کی رنگینی سے نقوش و خطوط میں مرصع کیا ہے لیکن یہ مرقع مالی امداد کے فقدان کی وجہ سے شائع نہیں ہو سکتا۔ کیا ہم حکومتِ پاکستان سے توقع کر سکتے ہیں کہ انہوں نے جہاں اتنا کیا ہے وہاں اپنے گوشۂ چشمِ التفات کو تھوڑا سا اور وا کر دیں تو یہ کام بھی بحسن و خوبی سر انجام پا جائے۔

واضح رہے کہ ہم جس آرٹ کی حوصلہ افزائی کو ضروری سمجھتے ہیں اس سے مراد وہ آرٹ نہیں جسے آرٹ کی خاطر (For Arts SAKE) ظہور میں لایا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک صرف وہ آرٹ قدر و قیمت کے لائق ہے جو حسنِ کائنات میں تخلیقی (Creative) اضافہ کرتا ہے اور جس سے معاشرہ میں ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کرنے والی قوتوں کی نشو و بالیدگی ہوتی ہے۔ جو آرٹ اس قسم کے تعمیری نتائج مرتب نہیں کرتا وہ قوموں کے لئے برگِ حشیش اور موت کا پیغام ہے اور اسے جتنی جلدی دفن کر دیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ قرآن کا خدا احسن الخالقین ہے۔ لہٰذا جس فن کا نتیجہ حسن کارانہ تخلیق نہیں وہ باطل کے نقوش کا مظہر ہے۔ "صبغۃ اللہ" (خدا کے رنگ) سے مرصع نہیں۔ یہی وہ آرٹ ہے جسے قرآن "شاعری" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جس کے پیچھے چلنے والوں کو وہ ٹڈی دل (غاوٗن) قرار دیکر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ وہ قوم کی ہری بھری کھیتیوں اور ثمر بار درختوں کو چٹ کر کے رکھدیتے ہیں۔ خدا ہر قوم کو ایسے آرٹ سے محفوظ رکھے۔

گر ہنر این است مرگِ آرزو ست اندرونش زشت و بیرونش نکوست

غور کر کے ان روایات سے کام کی باتیں اخذ کرے . . . . اسلئے یہ دعویٰ کرنا صحیح نہیں ہے کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہئے۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی جان لینے کی ہے کہ کسی روایت کے سنداً صحیح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اسکا نفس مضمون بھی ہر لحاظ سے صحیح اور جوں کا توں قابل قبول ہے۔

(۳) سنت کے متعلق عموماً لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ نبی صلعم نے جو کچھ اپنی زندگی میں کیا ہے وہ سب سنت ہے لیکن یہ بات ایک بڑی حد تک درست ہونے کے باوجود ایک حد تک غلط بھی ہے۔ دراصل سنت اس طریق عمل کو کہتے ہیں جسکے سکھانے اور جاری رکھنے کیلئے اللہ نے اپنے نبیؐ کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ طریقے خارج ہیں جو نبی نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا اختیار کئے . . . . جو امور آپ نے عادۃً کئے ہیں انھیں سنت بنا دینا اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں اللہ کا اور اس کے رسول کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ تحریف ہے جو دین میں کی جا رہی ہے۔

(۴) ان امور (یعنی دجال کی تفاصیل) کے متعلق جو مختلف باتیں حضور سے منقول ہیں وہ دراصل آپ کے قیاسات ہیں جن کے بارہ میں آپ خود شک میں تھے۔

سوال یہ ہے کہ مذکورہ بالا عقائد رکھنے والا شخص

(۱) صحیح معنی میں مسلمان اور متبع سنت کہلائیگا یا منکر حدیث

(۲) اگر منکر حدیث کہلائے گا تو اسلام میں اس کا کیا مقام ہے۔ اور

(۳) ایسا شخص دائرۂ اسلام سے خارج اور ملحد و بددین ہے یا نہیں؟ بینوا و توجروا۔ المستفتی

الجواب

مولانا عثمانی صاحب نے اس فتوی کا حسب ذیل جواب دیا

(۱) بظاہر یہ شخص منکر حدیث ہے

(۲) دائرۂ اسلام سے تو خارج نہیں مگر گمراہ اور مبتدع ہے۔ ایسے شخص سے مسلمانوں کو دور رہنا چاہئے اور اس کی باتوں پر ہرگز اعتماد نہ کرنا چاہئے۔ اس کو جاہل اجہل سمجھنا چاہئے۔ (نقل بخط) ظفر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ۔ از ڈھاکہ ۲۱ رجب ۱۳۷۲ھ

یہ عبارات سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعت اسلامی کی ہیں اور ان کا حوالہ حسب ذیل ہے۔

(۱) تفہیمات حصہ دوم ص ۳۲۷ - ۳۲۸

(۲) ترجمان القرآن بابت اکتوبر نومبر ۱۹۵۲ء ص ۱۱۳ و ۱۱۷

(۳) رسائل و مسائل ص ۲۱۰ و ۳۰

(۴) رسائل و مسائل ص ۵۵

مولانا عثمانی صاحب نے اپنے جواب کے علاوہ ان اقتباسات پر نوٹ بھی لکھے ہیں جن میں سے بعض بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً اقتباس ۲

ہیں جہاں مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ یہ تحریف ہے جو دین میں کی جا رہی ہے، اس پر مولانا صاحب نے لکھا ہے "اسکو تحریف کہنا پاگل پن ہے"۔

اقتباس ۲ میں جہاں مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ ان امور کے بارہ میں رسول اللہ صلعم خود شک میں تھے۔ اسکی بابت مولانا عثمانی صاحب لکھتے ہیں "جو شخص رسول کی شان میں ایسی باتیں کہتا ہے وہ جاہل ہے۔ وہ خود شک میں ہے، رسول کی شان اس سے پاک ہے۔"

بہرحال آپنے یہ دیکھ لیا کہ صدر جمعیۃ علمائے اسلام پاکستان کے نزدیک، مودودی صاحب منکر حدیث ہیں، گمراہ اور مبتدع ہیں، جاہل اجہل ہیں اور ان کا فتویٰ یہ ہے کہ ایسے شخص سے مسلمانوں کو دور رہنا چاہئے اور اسکی باتوں پر ہرگز اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔

اب رہا یہ کہ منکر حدیث کے متعلق جماعت اسلامی کا کیا فیصلہ ہے سو جماعت اسلامی کے جنرل سیکرٹری میاں طفیل احمد نے پنجاب کی تحقیقاتی عدالت میں حسب ذیل بیان دیا:-

عدالت کے سوال کے جواب میں گواہ نے بتایا کہ اسے اہل قرآن کے مذہبی نظریات کا پتہ نہیں لیکن اگر ایسی صورت ہو کہ وہ حدیث و سنت میں یقین نہ رکھتے ہوں تو پھر ان کو مسلمان نہیں کہا جائیگا۔ گواہ نے کہا کہ اسنے چکڑالویوں کے بارے میں سن تو رکھا ہے مگر اسے ان کے مذہبی نظریات کا پتہ نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان میں چالیس پچاس ہزار کے قریب احمدی ہیں۔

س: فرض کیجئے کہ پاکستان میں اہل قرآن کی کافی بڑی تعداد موجود ہے ایسی صورت میں کیا آپ ان کے بارے میں بھی اس قسم کے مطالبات کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھیں گے جیسا کہ احمدیوں کے بارے میں؟؟ —— ج: اگر وہ کسی قسم کی جارحانہ کارروائی کریں جیسا کہ احمدی کرتے ہیں اور ملک کے اندر ملک بنانا چاہیں تو ہم ان کے خلاف بھی اسی قسم کے مطالبات پیش کرینگے۔

س۔ اگر احمدی جارحیت سے رک جائیں اور مملکت کے اندر مملکت قائم کرنے کی کوشش بھی اگر کوئی ہو تو ترک کر دیں تو کیا آپ اس صورت میں بھی ان کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کرینگے —— ج: جی ہاں اسوقت تک جبتک کہ وہ ختم نبوت کے عقیدہ پر ہم سے متفق نہ ہو جائیں ہم ان سے ذمیوں کا سا سلوک کرینگے اور ان سے وہی سلوک کرینگے جو اسلامی قانون کے مطابق تجویز کیا گیا ہے۔

(امروز- لاہور- بابت ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۳ء)

اس سے آپ خود فیصلہ فرما لیجئے کہ جماعت اسلامی کے اپنے عقیدہ کی رو سے مودودی صاحب کی کیا پوزیشن ہے۔ اسکے ساتھ ہی اسے بھی سمجھ لیجئے کہ مودودی صاحب کا فیصلہ یہ ہے کہ جو مسلمان، مسلمان نہ رہے یعنی مرتد ہو جائے تو اسکی سزا قتل ہے۔ یعنی اس پورے معاملہ کا صغریٰ کبریٰ یوں قائم ہوا (۱) مولانا عثمانی کے فتوے کی رو سے مودودی صاحب منکر حدیث ہیں —— (۲) میاں طفیل احمد صاحب کے بیان کے مطابق منکر حدیث مسلمان نہیں رہتا —— (۳) اور مودودی صاحب کے فیصلہ کے مطابق جو مسلمان مسلمان نہ رہے اسکی سزا قتل ہے۔

جماعت اسلامی والے اس کے جواب میں حسب عادت یہ کہیں گے کہ فتویٰ میں مودودی صاحب کی عبارت کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ ہم نے ان عبارات کو اصل کتابوں سے ملا کر خود دیکھ لیا ہے اور ان کے حوالے بھی دیدیئے ہیں جس شخص کو اپنا اطمینان کرنا ہو وہ ان عبارات کو خود دیکھ لے اور آگے اور پیچھے سے پوری عبارات ملا کر اپنا اطمینان کرلے کہ انھیں کہیں توڑ مروڑ کر پیش نہیں کیا گیا ہے۔

نظامِ صلوٰۃ

(محترم عرشی صاحب)

حال میں ایک مولوی صاحب سے چند ملاقاتیں ہوئیں، ان ملاقاتوں میں جو گفتگوئیں ہوئیں ان میں سے بعض ایسی ہیں جن کو اپنے وسیع حلقۂ احباب تک پہنچانا مناسب سمجھتا ہوں۔ مولوی صاحب نرے مولوی نہیں ہیں۔ بی اے کی حد تک علیگ ہیں بزرگانِ دیوبند حضرات شیخ الہند اور مولانا عبید اللہ سندھی کے صحبت یافتہ ہیں۔ مولانا حمید الدین فراہی جو قرآن مجید کے مشہور مفسر ہیں کی خدمت میں رہ چکے ہیں۔ اس بڑھاپے میں مجاہدانہ جذبۂ تبلیغ رکھتے ہیں اور اپنی زبان و قلم کو قرآن مجید کی خدمت کے لئے وقف کئے ہوئے ہیں۔ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ "طلوعِ اسلام" کا مطالعہ نہایت فراخ دلی سے باقاعدہ فرماتے ہیں۔ اور ایک منصف مزاج ناظر کی طرح اس کے اکثر مندرجات سے اتفاق بھی کرتے ہیں۔

ایک صحبت میں آپ نے مجھ سے سوال کیا کہ یہ جو نئی بات نکالی جا رہی ہے کہ "صلوٰۃ" دراصل ایک نظام کا نام ہے اور مسلمانوں کی مروجہ نماز محض بے معنی اٹھک بیٹھک ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

میں نے عرض کیا — "نظامِ صلوٰۃ تو قرآن مجید کی کئی آیات سے ثابت ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں اور مروجہ نماز جو رکوع و سجود وغیرہ پر مشتمل ہے، یہ بھی اس نظامِ صلوٰۃ میں شامل ہے۔"

آپ نے مجھ سے اس اجمال کی تفصیل چاہی تو میں نے ان آیتوں کی طرف اشارہ کر دیا جو میرے نزدیک نظامِ صلوٰۃ کے قیام کی طرف رہنمائی کر رہی ہیں۔

آپ چونکہ میرے خیال میں ایک نیک نیت اور عالم شخص ہیں اسلئے کسی بحث و تکرار کے بغیر آپ نے میری گزارش کو تسلیم کر لیا۔ اسوقت میرے مخاطب حضرات سب کے سب ایسے نہیں جن کیلئے اشارات کافی ہو سکیں، اسلئے میں اپنے اس وقت کے بیان کو ذرا تفصیل سے بیان کروں گا۔

صلوٰۃ و نعمت | سورۂ مریم میں حضرات زکریا، یحییٰ، مریم، مسیح، ابراہیم، اسحٰق، اسمٰعیل، ادریس اور اولادِ آدم و نوح و ابراہیم و اسرائیل میں سے ہدایت یافتہ اور برگزیدہ لوگوں کا ذکر فرما رہے ہیں — اولٰئک الذین انعم اللہ علیہم یہ لوگ الٰہی نعمتوں سے نوازے گئے . . . . اذا تتلٰی علیہم اٰیات الرحمٰن خروا سجدا و بکیا۔ جب ان کے سامنے آیاتِ الٰہی تلاوت کی جاتی تھیں تو وہ سجدہ کرتے اور آنسو بہاتے ہوئے گر پڑتے تھے۔

صلوٰۃ و شہوات | ان کے بعد انہی کی نسل میں سے کچھ لوگ پیدا ہوئے ان کا ذکر الفاظ ذیل میں فرمایا ہے: فخلف من بعدھم

خلف اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیاً۔ یعنی ان کے بعد والوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا اور شہوات کے پیچھے پڑ گئے۔ اس کا نتیجہ ان کے حق میں تباہی ہوگا۔

اس آیت میں صلوٰۃ اور شہوات دو لفظ ایک دوسرے کی ضد کے طور پر آئے ہیں اور دونوں کے نتائج بھی لازماً متضاد ہیں۔ صلوٰۃ کے نتیجہ اوپر کی آیات میں نعمتیں، ہدایت اور برگزیدگی ہے اور یہ چیزیں ان کو اس دنیا میں بھی حاصل ہوئیں — نیز آیات رحمٰن کے ساتھ ان کا تعلق بالکل فرمانبردارانہ، ساجدانہ اور عجز و سوز و گداز لئے ہوئے ہوتا تھا (سجداً وبکیاً) اس میں روح صلوٰۃ بیان کی گئی ہے۔ یہ لوگ شہوات کی راہ کے رہرو نہیں تھے۔

اب دوسری قسم کے لوگ آتے ہیں جو صلوٰۃ کی روح سے منحرف اور شہوات کی منزل کے مسافر ہیں وہ نعمت، ہدایت اور اجتبا (برگزیدگی) سے محروم ہیں۔ "آیات رحمٰن" سے ان کو حقیقی سجود و بکا کی کیفیت حاصل نہیں ہوتی۔ ایسی کھلی گمراہی میں پڑ کر اگر وہ تباہی و ہلاکت سے بچے رہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کائنات میں کوئی قانون کام نہیں کر رہا۔ زہر و تریاق، نور و ظلمت، گالی اور دعا کی تاثیر میں کوئی فرق نہیں۔ اس کو تو کوئی دہری بھی نہیں مانتا، چہ جائیکہ قانون اور صاحب قانون خدا کو ماننے والے۔

شہوات کی تفسیر

شہوات کیا ہیں یہ بھی خود کہنے والے ہی کی زبان مبارک سے سن لیجئے:۔

زین للناس حب الشھوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ والخیل المسومۃ والانعام والحرث ذالک متاع الحیوٰۃ الدنیا واللہ عندہ حسن المآب۔

لوگوں کو نفسانی خواہشوں کی محبت بھلی معلوم ہوتی ہے[1] جیسے عورتیں بیٹے ڈھیروں ڈھیر سونا، چاندی، پلے ہوئے گھوڑے مویشی اور کھیتی یہ دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔

یہ چیزیں "دنیا کی زندگی" کی متاع تو ضرور ہیں لیکن انہی کے پیچھے پڑے رہنے کی ہرگز اجازت نہیں۔ دوسری جگہ اور زیادہ واضح انداز میں فرماتے ہیں:۔

واللہ یرید ان یتوب علیکم ویرید الذین یتبعون الشھوات ان تمیلوا میلاً عظیماً۔

اللہ یا کہ تم پر التفات و عنایت کرنا چاہتے ہیں اور شہوات کی پیروی کرنے والے چاہتے ہیں کہ تم بالکل ہی (شہوات کی طرف) جھک جاؤ۔

اس سے آگے مال کی باطل خوری کا ذکر آتا ہے۔

لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم ولا تقتلوا انفسکم۔

ایک دوسرے کے مال ناحق خورد برد نہ کیا کرو، ہاں آپس کی رضامندی سے خرید و فروخت درست ہے اور اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔

یہ شہوات ہی کی تفسیر ہے کہ زر اندوزی کے شوق میں حق و باطل کا امتیاز اٹھ جائے اس کا نتیجہ خود اپنی ہی ہلاکت ہے۔ اور یہ صلوٰۃ یا نظام صلوٰۃ کے قطعاً خلاف ہے۔

---

[1] زین للناس۔ بھلی بنا دی گئی ہے۔ (طلوع اسلام)

صلوٰۃ اور فحشاء و منکر

اتل ما اوحی الیک من الکتاب واقم الصلوٰۃ، ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر ولذکر اللہ اکبر واللہ یعلم ما تصنعون۔

وحی الٰہی جو کتاب کی صورت میں نازل ہورہی ہے اس کی تلاوت کرا ور صلوٰۃ قائم کر بلاشبہ صلوٰۃ بے حیائی کے کاموں اور ناشائستہ حرکتوں کو روک دیتی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ پاک کو معلوم ہے۔

شرح تلاوت

تلاوت کا مطلب عام طور پر یہی مشہور ہے کہ صبح اٹھ کر چند اوراق بے سمجھے بوجھے غلط سلط پڑھ لئے اور چوم چاٹ کر جزدان میں لپیٹ کر بلند جگہ پر رکھ دیا۔ اس طرح پڑھ لینے سے ہر حرف پر دس نیکیاں مل جاتی ہیں، اس پر حدیث شریف کی گواہی موجود ہے ـــ اس طرح کتاب مبارک کو بیکار کردیا۔ اس کے بعد نماز آئی، اس کو بھی بے سمجھے چند حرکات ادا کردینے میں محصور کردیا اور اس کی جان نکال لی۔ حالانکہ خود قرآن نے تلاوت وصلوٰۃ کی شرح کردی ہے۔

راغب نے تلاوت کو قرآت سے اخص قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ ہر تلاوت قرارت ہے لیکن ہر قرآت تلاوت نہیں۔ قرارت سے آگے تلاوت کیا ہے؟ ـــ اقتداء فی الحکم ـــ تدبر المعنی ـــ حکم کی پیروی کرنا معنی کو سوچنا سمجھنا ـــ اس کی سند کیا ہے "والقمر اذا تلاھا" ـــ نراد بہ ھاھنا الاتباع علی سبیل الاقتداء یہاں مراد اتباع ہے اقتداء کے طریقے پر ـــ دوسری سند دیکھئے "یتلوہ شاھد منہ" ای یقتدی بہ ویعمل بموجب قولہ۔ یعنی اس کی پیروی کرتا ہے اور اس کے قول کے مطابق عمل کرتا ہے ـــ اور دیکھئے۔ "یتلون اٰیات اللہ"۔ والتلاوۃ تختص باتباع کتاب اللہ المنزل تارۃ بالقرأۃ وتارۃ بالارتسام لما فیھا من امر ونھی وترغیب وترھیب ـــ تلاوت خدا کی نازل کردہ کتابوں سے خصوصیت رکھتی ہے کبھی قرآت سے اور کبھی اس کی ترغیب وترہیب اور امر و نہی کو بجا لانے سے ـــ اس سے آگے قرارت کی شرح بھی کرتے ہیں ـــ وانما یقال فی القرآن فی شیٔ اذا قراتہ وجب علیک اتباعہ۔ جب قرآن مجید کے کسی حصہ کی قرارت کروگے تو تم پر اس کی پیروی واجب ہوجائے گی ـــ ایک اور آیت میں اہل کتاب کا ذکر فرماتے ہیں ـــ یتلونہٗ حق تلاوتہ۔ فاتباع لہ بالعلم والعمل۔ کتاب کی تلاوت کا حق اس طرح ادا ہوتا ہے کہ علم و عمل سے اس کی پیروی کی جائے۔

یہ تھی تلاوت جو اپنے مغز سے محروم ہو کر صرف چھلکا بن کر رہ گئی ہے۔

اسی طرح صلوٰۃ کو دیکھئے تو اسی آیت میں اُسے "اقم" کے تحت لاکر اس کے باقاعدہ نظام کی اقامت کا اعلان فرمایا ہے پھر جب یہ نظام قائم ہوجائے تو اس کا فرمودہ خدا قطعی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ فحشا و منکر کا سدباب ہوجائے ـــ اس وقت یہودی عیسائی اور مسلمان سب ہی نمازیں پڑھ رہے ہیں اور فحشا و منکر کی ان سب میں وہ ارزانی ہے کہ حدوحساب نہیں۔ ڈاکٹر کہے کہ منگنیشیا سے چند اجابتیں ہوں گی تو کوئی شک نہیں کرتا اور خدا کہے کہ صلوٰۃ سے فحشا و منکر کا خاتمہ ہوجائے گا تو کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔ صدیوں سے "صلوٰۃ" بھی جاری اور فحشا و منکر بھی روز بروز ماضاعف ہوتے جارہے ہیں۔ کیا خدا کی بات ڈاکٹر سے بھی کم وقعت ہے۔ کیا وہ کوئی یونہی شاعرانہ تعلی ہے؟ (معاذ اللہ)۔ وہ یقیناً سچ فرماتا ہے۔ اقوام کی کتابوں میں اس کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ جب کسی جماعت میں صلوٰۃ کا

دور دورہ ہوا تو فحشا ومنکر کا خاتمہ ہو گیا، جیسا کہ اوپر کی پیش کردہ سب سے پہلی آیت میں آپ دیکھ چکے ہیں — یقین کیجئے کہ اس زمانے کی بے روح صلوٰۃ بلاشبہ "اضاعوا الصلوٰۃ" کی تعریف میں آتی ہے۔ اسلئے کہ اس کا وہ نتیجہ نہیں نکلتا جو اصدق القائلین اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اس کا قول کبھی غلط نہیں ہو سکتا ہمارا عمل غلط ہے۔

ابراہیمؑ اور صلوٰۃ حضرت ابراہیم علیہ السلام جن کا مرتبہ یہ ہے کہ امت مسلمہ کو ان کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے، یہانتک کہ حضرت خاتم النبیین صلعم بھی ان کی پیروی پر مامور ہیں۔ اور انبیا اولوالعزم موسیٰؑ عیسیٰؑ وغیرہ بھی انہی کی اقتدا پر ناز کرتے ہیں۔ تعمیر کعبہ کے وقت ان کی دعا تھی کہ اے پروردگار میں نے تیرے معزز گھر کے نزدیک اپنی اولاد کو صرف اس غرض سے بسایا ہے "لیقیموا الصلوٰۃ" کہ صلوٰۃ کی اقامت کریں۔ پھر آگے بڑھ کر اپنے لئے دعا کرتے ہیں "رب اجعلنی مقیم الصلوٰۃ" اے پروردگار! مجھے صلوٰۃ قائم کرنے والا بنا — اوپر کی بات کو پھر دہراتے ہیں "ومن ذریتی" اور میری اولاد کو بھی" — اگر نماز اسی اٹھک بیٹھک کا نام ہے جس کو ایک ۱۲ سال کا بچہ بھی بے تکان رٹ لیتا ہے تو اتنے بڑے پیغمبر کو اس التجا کی تکرار کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو وہی بات ہوئی کہ ایک ایم اے پاس کسی پروفیسر سے جا کر کہے کہ مجھے اے بی سی پڑھا دیجئے — اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقامت صلوٰۃ یا نظام صلوٰۃ بڑی اہمیت کی چیز ہے۔ جو ایک اعلیٰ سوسائٹی کا آخری مقصود ہو سکتی ہے، جس کو قائم کرنے کے لئے انبیاء اولوالعزم کو بھی مسلسل سعی و دعا کی ضرورت ہوتی ہے — آج ہماری ہر نماز میں یہ فقرہ دہرایا جاتا ہے لیکن کچھ پتا نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ اور جن کو ترجمے کا پتا ہے وہ بھی صرف پڑھ لینے کو تعمیل حکم سمجھے ہوئے ہیں۔ الا اللہ خیر سلا

شعیبؑ اور صلوٰۃ مدین کے پیغمبر حضرت شعیبؑ اپنی قوم کو وعظ فرما رہے ہیں۔

"اے میری قوم! اللہ تعالیٰ کی عبدیت اختیار کرو (عبدیت شرح طلب ہے) اس کے سوا تمہارا کوئی حاکم نہیں، اور ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو۔ تم مجھے خوش حال نظر آتے ہو۔ اگر تم باز نہ آئے تو مجھے تمہاری نسبت عذاب عام کے دن کا اندیشہ ہے اور اے قوم ماپ تول کو انصاف سے پورا کیا کرو اور لوگوں کی چیزیں انھیں کم نہ دیا کرو اور اس طرح زمین میں فساد کو عام نہ کرو۔ اللہ کا دیا ہوا (جائز کمائی سے) جو بچے وہی تمہارے لئے اچھا ہے اگر تم مانو اور میں تمہارا نگہبان تو ہوں نہیں۔"

اس وعظ کو آپ نے سمجھ لیا، قریب قریب بالکل کاروباری باتیں ہیں، کہیں بھی ورد، وظیفہ، رکوع وسجود کا ذکر نہیں۔ اس کے جواب میں قوم نے کیا کہا؟

یاشعیب اصلوٰتک تامرک ان نترک ما یعبد اٰباؤنا او ان نفعل فی اموالنا ما نشاء

اے شعیب! کیا تیری صلوٰۃ تجھے حکم دیتی ہے کہ تو ہمیں ہمارے معبودوں کی عبادت سے روکے اور اپنے مالوں میں جس طرح ہم تصرف کرنا چاہیں اسے بھی چھوڑ دیں۔

اس تقریر اور جواب تقریر سے صاف واضح ہوتا ہے کہ صلوٰۃ عقائد و اعمال دونوں کی صحت کی ضامن ہے۔ انسان کے اپنے عبودیت اور اس کی معاشرت میں توازن و اعتدال پیدا کرتی ہے۔ جن لوگوں کا تعلق خدا سے صحیح نہیں اور وہ آپس کے حقوق عن کا

احترام نہیں کرتے وہ لاکھ اٹھک بیٹھک اور ورد و ظائف کرتے رہیں قرآن کے نزدیک یا عنداللہ وہ نمازی نہیں ہیں۔

صلوٰۃ سے بے خبری

ارءیت الذی یکذب بالدین الخ

کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جو قانونِ مکافات کی تکذیب کر رہا ہے۔ یہ شخص یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین نوازی کے خلاف رہتا ہے۔ ایسے نمازیوں کی تباہی ہے جو اپنی نماز کی حقیقت سے بے خبر ہیں۔ جو ریاکاری کرتے ہیں اور عام استعمال کی چیزوں پر خزانے کا سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں۔

اس چھوٹی سی سورت میں بھی مرکزی چیز نماز ہے۔ قریبی نفع اور شخصی مفاد کی پرستش اور عام معاشرے کی فلاح و بہبود سے غفلت۔ تباہی پر منتج ہوتی ہے۔ یہ شہوات کی راہ ہے جو صلوٰۃ کے منافی ہے۔ کیونکہ صلوٰۃ کا تقاضا ہے قریبی مفاد سے ہٹ کر دور رس نتائج پر نگاہ رکھنا (الدین) یتیم پروری اور مسکین نوازی سے قوم میں ایک مساواتی سطح پیدا کرنا۔ ضروریاتِ زندگی کو بارش اور پانی کی طرح ہر شخص تک پہنچانا۔ (ماعون کے یہی معنی ہیں)۔

قرآن مجید میں صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ بیسیوں جگہ مالیاتی اصطلاحات، زکوٰۃ، صدقات وغیرہ وارد ہوئی ہیں۔ یہ کوئی برائے قافیہ نہیں بلکہ مالیات سے صلوٰۃ کا غیر منفک تعلق ہے، جیسا کہ آپ ذکر شعیبؑ میں دیکھ چکے ہیں اور اس کو افراد کی مرضی پر نہیں چھوڑا جا سکتا لاجرم اس کیلئے ایک اجتماعی نظام کی ضرورت ہے جیسا کہ سورۂ جمعہ میں "صلوٰۃ اور جمعہ" کے لفظ سے ظاہر ہوتا ہے۔

صلوٰۃ واجتماع

اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ

اس سورہ کو رسم و روایت سے ذہن کو صاف کر کے دیکھیں تو یہ اپنے اندر قومی فلاح کا ایک لازوال پیام رکھتی ہے (لعلکم تفلحون) جمعہ ہفتہ کے سات دنوں میں سے کسی دن کا نام نہیں تھا۔ بلکہ یہ امیر قوم کی دعوت اجتماع کا دن تھا۔ اس دعوت و ندا کو ہر قسم کی بیع و تجارت اور سیر و تفریح پر ترجیح دینا لازم ہے۔ پھر جب تک امیر قوم سے خطاب کر رہا ہے اسوقت تک جگہ سے ہٹنے کی اجازت نہیں، اس اجتماع میں ہوگا کیا؟ صلوٰۃ اور ذکر اللہ۔ صلوٰۃ کا کچھ بیان آپ اوپر پڑھ چکے۔ ذکر اللہ سارا قرآن ہے اور قرآن میں انسانی زندگی، موت، اور بعد الموت کی ہر جزئی و کلی موجود ہے۔ اجتماعی فائدے کی خاطر وقتی فائدہ بیع وغیرہ کو چھوڑنا ہوگا، کیونکہ اس محدود اور شخصی رزق سے وہ رزق جو ساری قوم کو پہنچے یقیناً بہتر ہے، سورہ کا خاتمہ اسی پر ہے۔ واللہ خیر الرازقین۔

دیکھا آپ نے بات صلوٰۃ سے شروع ہوئی اور خیر الرازقین پر آ کر ختم ہوئی۔

آپ محسوس کر رہے ہوں گے کہ میں بات کو بہت ہی سمیٹ رہا ہوں اور زیادہ سے زیادہ اختصار سے کام لے رہا ہوں، جو کچھ ذہن میں ہے وہ ایک کتاب کا تقاضا کر رہا ہے لیکن اُسے ایک مختصر مقالے میں ختم کرنا ضروری ہے اسلئے ایک اور مقام کی طرف اشارہ کرتا ہوں جو پورے نظام صلوٰۃ کو حاوی ہے۔ سورۂ معارج کھول کر سامنے رکھ لیجئے اور نمازیوں کے اوصاف پڑھئے۔ پھر اپنی نماز اور اپنے نمازیوں کو دیکھئے کہ کہاں تک قرآنی صلوٰۃ کے ساتھ چلتے ہیں۔

انسان کی عام حالت یہ ہے کہ وہ بے صبر، حریص اور گھبرانے والا پیدا کیا گیا ہے، چنانچہ جب اسے تکلیف پہنچتی ہے تو چیختا چلاتا

شر شروع کردیتا ہے اور جب کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو اُسے اپنے ہی تک بند کرلیتا ہے (منوعاً سخت بخیل) مگر اہل صلوٰۃ ان عیوب سے پاک ہیں ـــــ وہ اہل صلوٰۃ کون ہیں؟ ـــــ جن میں مندرجہ ذیل صفات پائی جائیں۔

۱ ـــــ جو اپنی نماز پر دوام کرتے ہیں (یہ رکوع و سجود و جماعت کی نماز ہے)۔

۲ ـــــ جن کے مالوں میں سائل وغیر سائل مستحق کا لازمی حصہ ہوتا ہے (حق معلوم)

۳ ـــــ جو نتائج اعمال کی تصدیق اپنے عقیدہ و عمل سے کرتے ہیں۔

۴ ـــــ جو ربانی سزا سے ڈرتے رہتے ہیں، کیونکہ وہ ڈرنے ہی کی چیز ہے۔

۵ ـــــ جو اپنے جنسی جذبات کا غیر محل استعمال نہیں کرتے، کیونکہ ایسی صورت میں کوئی ملامت نہیں (عالمگیر دین میں نہ ہی اتباع شہوات کی گنجائش ہے اور نہ ہی رہبانیت کے لئے کوئی جگہ ہے)

۶ ـــــ جو لوگ اپنے عہد و امانت کی پوری پوری رعایت کرتے ہیں۔

۷ ـــــ جن کو بڑے سے بڑا لالچ سچی شہادت سے اِدھر سے اُدھر نہیں کرسکتا۔

۸ ـــــ آخری بات یہ ہے کہ جو لوگ اپنی ان (مذکورہ بالا) نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہ لوگ جنتوں میں معزز ہیں (ایک ہی سلسلہ کلام میں دو جگہ صلوٰۃ کا لفظ یقیناً دو مختلف مفہوم ادا کررہا ہے)۔

ایک دفعہ ان صفات پر کر نظر کر جائیے! پھر تصور کیجئے کہ ایک بستی ہے جس کے تمام باشندے ان صفات کے حامل ہیں۔ پھر غور کیجئے کیا وہاں کسی پولیس، عدالت، جیل وغیرہ کی ضرورت ہوگی؟ کیا وہ لوگ اسی دنیا میں جنت کا ابتدائی نقشہ نہ دیکھ لیں گے؟ ـــــ کون ہے جو ان کے نظام معاشرہ کو دیکھ کر اس میں شامل ہونے سے انکار کرے؟ ـــــ کون ہے جو اپنے ملک میں ایسا معاشرہ قائم کرنے کا خواہشمند نہ ہو؟ ـــــ اس قسم کا نمازی، ایک ہمسایہ، ایک دوست یا ایک رشتہ دار ہی مل جائے تو زندگی پُرلطف ہوجاتی ہے، پھر جہاں سارا معاشرہ ایسا ہو اس کی فردوسیت و نورانیت کا کیا ٹھکانا ہے۔ اشرقت الارض بنور ربھا ـــــ زمین اپنے پروردگار کے نور (قرآنی قانون) سے چمک اٹھے گی۔

یہاں پہنچکر ایک اور مقام کی طرف ذہن منتقل ہورہا ہے ـــــ سورۂ مدثر کا دوسرا رکوع دیکھئے! اہل جنت، اہل دوزخ مجرموں سے پوچھ رہے ہیں:

"کیوں بھئی! اس دوزخ میں کیسے آنا ہوا؟"

وہ جواب دیتے ہیں:

۱ ـــــ ہم نمازی نہیں تھے۔

۲ ـــــ ہم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔

۳ ـــــ ہم بیہودہ خرافات میں لگے رہتے تھے۔

۴۔ ہم نتائج اعمال و پاداش کردار سے بے پروا تھے ۔۔۔ یہانتک کہ ہمیں موت نے آ لیا۔"

یہ وہ حالت ہے کہ ہزار شفیع محشر آئیں تو بچا نہیں سکتے (فما تنفعهم شفاعة الشافعين۔)

اگر خدائے نباشد ز بندۂ خوشنود شفاعت ہمہ پیغمبراں ندارد سود

یہاں بھی آپ نے دیکھ لیا کہ نماز کے ساتھ مسکین نوازی، وقت کی قدردانی اور دور رس انجام پر نظر کس طرح لوازم کے طور پر لگے ہوئے ہیں۔

آپ کی انجمنیں تعلیمی ہوں یا کسی اور مقصد کی حامل ۔۔۔ سال بھر اپنے پروگرام کے مطابق کام کرتی رہتی ہیں۔ پھر اس کے تمام ارکان و معاونین کے سالانہ، ماہانہ اور ہفتہ وار اجتماعات بھی ہوتے رہتے ہیں۔ ان اجتماعوں میں وہ اپنی کارگزاری کی رپورٹ پیش کرتے ہیں۔ ضروریات کا جائزہ لیتے ہیں، آئندہ کیلئے لائحہ عمل تجویز کرتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ

اوپر جو نظامِ صلوٰۃ بتایا گیا ہے، اس کو بھی زندہ و پائندہ رکھنے کے لئے اجتماعات کی ضرورت ہے، جیسا کہ آپ سورۂ جمعہ میں دیکھ چکے ہیں۔ اس کی اہمیت کے پیش نظر روزانہ جماعت کی بھی ضرورت ہے جس کو قرآن مجید صلوٰۃ موقوت کہتا ہے (ان الصلوٰة كانت على المومنين كتاباً موقوتاً) پھر وہ اس کے لئے نہایت ہی مناسب وقت بھی تجویز کرتا ہے۔ اس جماعتی صلوٰۃ کے علاوہ انفرادی صلوٰۃ کی طرف بھی رہنمائی کرتا ہے اور ساتھ ساتھ اس کے فائدے بھی بتاتا جاتا ہے ۔۔۔ حضرت زکریا کا ذکر ہو رہا ہے کہ انہوں نے بیٹے کے لئے دعا کی اور فرشتوں نے ان کو آواز دی جب کہ وہ محراب میں نماز ادا کر رہے تھے۔ (وهو قائم يصلي في المحراب) کہ اللہ تعالیٰ آپ کو یحییٰؑ کی بشارت دیتے ہیں۔

اس وقت جو نمازیں پڑھی یا ادا کی جا رہی ہیں۔ جو لوگ ان کو مٹا دینا چاہتے ہیں، وہ منشاء قرآن سے دور جا رہے ہیں ۔۔۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ نمازیں وہ نتیجہ ہرگز پیدا نہیں کرتیں جو قرآن چاہتا ہے اور جو عہد نبویؐ میں پیدا ہوا یا وقتاً فوقتاً بعد کی صدیوں میں کہیں کہیں اس کا کچھ عکس سا نظر آ جاتا ہے۔ لیکن اس بے ثمری کے باوجود اس کے ختم کر دینے کے لئے کوئی وجہ جواز پیدا نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ اپنے مریض کو زہر دے کر ختم نہیں کر دیتے بلکہ اس کی صحت کے لئے کوشاں ہی رہتے ہیں تو موجودہ نماز کو صحیح اور بانتیجہ بنانے کی کوشش کیوں نہ جاری رکھیں۔

صرف نماز کا کیا قصور ہے؟ ہمارے دوسرے مذہبی اعمال کون سا نتیجہ پیدا کر رہے ہیں پھر کیا اسلام ہی کو چھوڑ کر کافر ہو جائیں؟ ہم میں سے ہر شخص کو لازم ہے کہ اپنے اسلام اور اسلامی اعمال نماز وغیرہ کو قرآن مجید کے مطابق بنانے کی کوشش لگاتار کرتے رہیں اگر ہم انفرادی صلوٰۃ کو درست کر سکیں، جو بہت زیادہ مشکل نہیں تو جماعتی صلوٰۃ کے لئے بھی تدریجاً راستہ ہموار ہو سکتا ہے۔ جماعتی صلوٰۃ یا نظامِ صلوٰۃ کی غیر موجودگی کی صورت میں انفرادی صلوٰۃ سے بھی محروم ہو جانا کسی حالت میں بھی گوارا نہیں ہونا چاہئے ۔۔۔ میں نے اس مضمون میں جزئیات کی تفصیل سے قصداً احتراز کیا ہے کیونکہ اتنے میں اس کی گنجائش نہیں اور نہ ہی مجھے اپنا فہم دوسروں پر ٹھونسنے کا حق پہنچتا ہے۔

عرشی

استدراک

ہمیں خوشی ہوئی کہ طلوع اسلام نے جو یہ آواز اٹھائی تھی کہ "اقیموا الصلوٰۃ" کے معنی فقط "نماز پڑھنا" نہیں بلکہ اس سے مفہوم ہے قرآنی معاشرہ کا قیام جو زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہو۔ اس کا چرچا اب دور دور تک ہونے لگ گیا ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

محترم عرشی صاحب اس باب میں ہمارے ہم صفیر ہیں اور ان کا زیر نظر مقالہ اسی دعوت کی تبلیغ۔ ہمارے محترم نے اپنے مقالہ کے آخر میں البتہ ایک ایسی بات کہی ہے جس سے ہمیں بصد احترام تھوڑا سا اختلاف ہے۔ یا یوں کہئے کہ ہمارے نزدیک وہ نکتہ وضاحت طلب ہے جیسا کہ انھوں نے اپنے مضمون میں بصراحت لکھا ہے، قرآن کی رو سے صلوٰۃ ایک اجتماعی عمل ہے جس سے صحیح قرآنی معاشرہ قائم ہوتا ہے۔ صلوٰۃ کے معنی ہی متوازن باہم حرکت اور قانون خداوندی کی مسلسل اتباع ہے اور ظاہر ہے کہ یہ چیز اجتماعی ہے انفرادی نہیں۔ جہاں تک ہماری بصیرت یاوری کرتی ہے ہمیں قرآن سے انفرادی صلوٰۃ کی طرف راہنمائی کہیں نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی اور انفرادی صلوٰۃ میں یہی فرق نہیں کہ جب صلوٰۃ کو بہت سے لوگ مل کر ادا کرلیں تو وہ اجتماعی کہلاتی ہے اور جب اسے ایک فرد تنہائی میں ادا کرے تو وہ انفرادی صلوٰۃ ہوتی ہے۔ ان دونوں میں بنیادی فرق ہے۔ اجتماعی صلوٰۃ اور انفرادی صلوٰۃ (اگر انفرادی کو بھی صلوٰۃ کہا جاسکے تو) دو الگ الگ تصورات کی ترجمان ہیں۔ اجتماعی صلوٰۃ کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ قرآن کی رو سے فرد کی تربیت ذات معاشرے کے اندر (اور اس کا جزو بننے) ہی سے ہوسکتی ہے اور عبادت سے مفہوم ہے قوانین خداوندی کی بے لاگ اور بے لوث اطاعت جو (پھر) معاشرہ کے اندر ہی ممکن ہے، انفرادی طور پر ممکن نہیں۔ اس کے برعکس، انفرادی صلوٰۃ کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ ایک فرد اپنا "تزکیۂ نفس" معاشرہ سے الگ ہٹ کر انفرادی طور پر کرسکتا ہے۔ اور عبادت سے مقصود ہے خدا کی پرستش، جو انفرادی طور پر بھی کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں تصورات، اپنی اصل و بنیاد کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ قرآن انفرادی تصورحیات کے خلاف صدائے احتجاج ہے اور اجتماعی تصورحیات کا داعی، لہذا یہ ہو نہیں سکتا کہ قرآن، جو اجتماعی صلوٰۃ کا نقیب ہو، ساتھ ہی انفرادی صلوٰۃ کی بھی راہ نمائی کرے اور اس کے فوائد بتائے۔ جسے انفرادی صلوٰۃ کہا جاتا ہے وہ درحقیقت دعا ہے (قرآنی صلوٰۃ نہیں جسے قائم کیا جاتا ہے) اور خود حضرت زکریاؑ کا واقعہ (جس سے محترم عرشی صاحب انفرادی صلوٰۃ کی دلیل لائے ہیں) اس کی تائید کرتا ہے۔ قصۂ حضرت زکریاؑ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے ھنالک دعا زکریا ربہ ۳/۳۸ زکریا نے اپنے رب سے دعا مانگی اور کہا کہ تو مجھے اپنے ہاں سے اولاد عطا فرمادے۔ انک سمیع الدعاء۔ اس کے بعد ہے کہ وہ ہنوز قربان گاہ میں کھڑا دعا مانگ رہا تھا کہ خدا نے اسے بیٹے کی بشارت دیدی (فنادتہ الملٰئکۃ وھو قائم یصلی فی المحراب ۳/۳۸)۔ قرآن نے ان الفاظ (وھو قائم یصلی فی المحراب) کا اضافہ یہ بتانے کیلئے کیا ہے کہ حضرت زکریاؑ نے ابھی اپنی دعا ختم بھی نہیں کی تھی کہ خدا نے اسے استجابت سے نواز دیا۔ سورۂ مریم میں اس امر کی صراحت کردی گئی ہے کہ زکریاؑ کا دعا مانگنا، اس کی دعا کا قبول ہوجانا اور اسے بیٹے کی بشارت مل جانا، سب ایک ہی وقت میں ہوگیا تھا۔ چنانچہ جب یہ کچھ ہوگیا تو فخرج علیٰ قومہ من المحراب ۱۹/۱۱ زکریا، قربان گاہ سے نکل کر اپنے لوگوں کی طرف آیا۔ لہذا، حضرت زکریاؑ کے قصہ میں یصلی فی المحراب کے معنی قرآن کی مصطلح صلوٰۃ ادا کرنا نہیں بلکہ بیٹے

کی دعا مانگنا ہے۔ صلوٰۃ کا لفظ دعا کے معنوں میں قرآن میں متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے (مثلاً ان صلوٰتک سکن لھم (۹/۱۰۳) تیری دعا ان کیلئے وجہ تسکین ہوتی ہے) لہٰذا یہ کہنا تو درست ہے کہ دعا انفرادی طور پر مانگی جا سکتی ہے لیکن یہ کہنا ٹھیک نہیں ہوگا کہ قرآنی صلوٰۃ، اجتماعی طور پر بھی ادا ہو سکتی ہے اور انفرادی طور پر بھی۔ واضح رہے کہ جو نمازیں اس وقت ہم باجماعت (یعنی بزعم خویش اجتماعی) بھی پڑھتے ہیں وہ بھی درحقیقت انفرادی صلوٰۃ ہے۔ اسلئے کہ اس میں بھی بنیادی تصور خدا کی پرستش اور انفرادی تزکیہ کا ہے۔ لہٰذا اس وقت نہ تو کسی ایک فرد کی الگ ادا کردہ نماز ہی قرآنی صلوٰۃ ہے اور نہ ہی نماز باجماعت ہی قرآنی صلوٰۃ۔

قرآن نے تشکیل معاشرہ کا جو پروگرام دیا ہے اس میں اس کی بھی صراحت کر دی ہے کہ اس مقصد کے لئے وقتی اجتماعات بھی ضروری ہیں جن میں خدا کی حمد و ستائش اور اقرار اطاعت و انقیاد کے بعد اہم معاملات کے متعلق باہمی مشاورت کی جائے انہی کو موقت اجتماعات صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں باہمی مشاورت اور قیام صلوٰۃ کا حکم اکٹھا آیا ہے۔ سورۃ الشوریٰ میں ہے والذین استجابوا لربھم۔ واقاموا الصلوٰۃ وامرھم شوریٰ بینھم ومما رزقنٰھم ینفقون (۴۲/۳۸) یعنی یہ ان لوگوں کی جماعت ہے جو اپنے خدا کے قانون ربوبیت پر لبیک کہتے ہوئے نظام صلوٰۃ کو قائم کرتے ہیں اور ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پاتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں دے رکھا ہے اسے ربوبیت عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔

تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ عہد نبی اکرمؐ اور صحابہؓ میں جب کبھی کوئی ایسا اہم واقعہ پیش آتا جس کے لئے فوری اجتماع کی ضرورت ہوتی تو اس کے لئے جو اعلان کیا جاتا تھا اس میں کہا جاتا تھا کہ "الصلوٰۃ جامعۃ" چنانچہ اس اعلان کو سن کر لوگ جمع ہو جاتے اور مسئلہ پیش نظر پر غور و خوض کر لیا جاتا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس دور میں الصلوٰۃ سے مفہوم کیا تھا۔

اس کے بعد محترم عرشی صاحب فرماتے ہیں کہ "اگر ہم انفرادی صلوٰۃ کو درست کر سکیں جو زیادہ مشکل نہیں تو جماعتی صلوٰۃ کے لئے تدریجاً راستہ ہموار ہو سکتا ہے۔" عرشی صاحب نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی کہ "انفرادی صلوٰۃ کی درستگی" سے ان کا مقصود کیا ہے؟ یہ آواز ہزار برس سے (اور قریب قریب ہر نماز کے وقت ہر مسجد سے) ہمارے کانوں میں آ رہی ہے کہ تم اپنی نمازوں کو درست کرو۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتاتا کہ اس سے مفہوم کیا ہے؟ مسجد میں آواز دینے والے کا مفہوم تو یہ ہوتا ہے کہ تم نماز کے فرائض، واجبات، سنن، مستحبات وغیرہ کا نہایت احتیاط سے خیال رکھو۔ اس کے ارکان کو ٹھیک ٹھیک طور پر ادا کرو۔ کھڑے ہو تو دونوں پاؤں میں اتنا فاصلہ ہو تکبیر کے لئے ہاتھ اٹھیں تو کانوں کی لو تک پہنچیں۔ قیام میں ہاتھ فلاں مقام پر رہیں، رکوع میں جھکنے کی یہ شکل ہو، سجدہ میں یہ صورت وغیرہ وغیرہ۔ خلوت میں ایسی تاکید کرنے والے سے پوچھو تو وہ کہدیگا کہ نماز خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرو۔ اس میں حضور قلب نہایت ضروری ہے۔ انسان کو عاجزی اور ناتوانی سے خدا کے حضور رونا اور گڑگڑانا چاہیئے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس ہزار برس میں کروڑوں انسان ایسے گذر چکے ہیں (اور آج بھی کروڑوں نہیں تو لاکھوں ایسے ہوں گے) جو اپنی نمازوں میں ارکان و تعدیل کا بھی خیال رکھتے تھے (اور رکھتے ہیں) اور ان کے دل میں خشوع و خضوع بھی تھا (اور ہوتا ہے) لیکن اس کے باوجود یہ نمازیں وہ نتائج تو مرتب نہ کر سکیں (نہ آج کر رہی ہیں) جنھیں قرآن نے صلوٰۃ کا لازمی ثمرہ قرار دیا ہے اور جن کا ذکر محترم عرشی صاحب نے اپنے مقالہ

میں اس حسن و ایجاز سے کیا ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ ہماری اصل خرابی یہ تھی کہ ہم نے سمجھ لیا کہ انفرادی صلوٰۃ کو درست کرنے سے قرآنی صلوٰۃ کے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ لیکن جب انفرادی صلوٰۃ، قرآنی صلوٰۃ ہے ہی نہیں تو اس کی درستگی سے قرآنی صلوٰۃ کے ثمرات کس طرح حاصل ہو سکتے ہیں؟ آپ انفرادی نماز میں "خشوع و خضوع اور حضورِ قلب" پیدا کر کے زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ اپنی دعاء میں اور رقت پیدا کر لیں اور خدا کی پرستش پوری توجہ کے ساتھ کر لیں۔ انفرادی نماز کی درستگی سے اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن اس سے وہ ثمرات تو حاصل نہیں ہو جائیں گے جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جماعت مومنین جب نظامِ صلوٰۃ سے قوانین و احکام خداوندی کا اتباع کرے گی تو وہ اتباع محض مشینی طور پر نہیں ہوگا۔ اس میں پورا پورا سوز و گداز اور عجز و نیاز شامل ہوگا۔ یعنی وہ اتباع، دل کی گہرائیوں سے ابھرے گی اور خون کے ذرہ ذرہ میں حلول کر جائیگی۔ اور اس اتباع سے جو درخشندہ نتائج مرتب ہوں گے وہ انسان کے لئے حقیقی مسرت اور سچی طمانیت کا موجب بن جائیں گے۔ اس طرح اسی نظامِ صلوٰۃ میں انسان کی عقل و بصیرت اور جذبات دونوں حقیقی تسکین حاصل کر لیں گے۔ لیکن جب نظامِ صلوٰۃ باقی نہ رہے تو "دنیا پرست" عقلی حیلہ جوئیوں سے ساز و سامانِ زندگی حاصل کر لیتے ہیں اور اس طرح ان کے جذبات کی تسکین ہو جاتی ہے اور "دیندار" انفرادی پرستش سے اپنے جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کر لیتے ہیں۔ قرآن نے جب یہ کہا تھا کہ (فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشہوٰت فسوف یلقون غیا ($\frac{19}{59}$) یعنی حضرات انبیاء کے بعد ان کے متبعین نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا اور شہوات کے پیچھے لگ گئے سو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی تھا) تو اس میں اتباعِ شہوات سے مراد یہ تھی کہ یہ لوگ اپنے جذبات کی تسکین قوانین خداوندی کے علاوہ دوسرے طریقوں سے چاہتے تھے۔ یہ تھی ان کی غلطی۔ واضح رہے کہ قرآن کی رو سے جذبات کی تسکین بری بات نہیں۔ بری بات یہ ہے کہ جذبات کی تسکین غیر خدائی طریقوں سے کی جائے۔ جذبات کی تسکین کا ایک ذریعہ قیامِ صلوٰۃ ہے جس میں دنیاوی خوشگواریوں کے حصول اور انسانی ذات کی تربیت و استحکام سے انسانی جذبات کی صحیح صحیح تسکین ہو جاتی ہے۔ دوسرا طریقہ ہے صلوٰۃ ضائع کر کے اپنے طور پر جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرنا۔ یہ طریق غلط ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ انسانی جذبات صرف "حیوانی جذبات" تک ہی محدود نہیں۔ ان میں وہ "مقدس جذبات" بھی شامل ہیں جن کی تسکین مذہب پرست طبقہ انفرادی پرستش کی رو سے حاصل کر لیتا ہے (اور جسے قرآن نے رہبانیت کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے) لہٰذا اگر رہبانیت میں "انفرادی صلوٰۃ" (یعنی خدا کی پرستش سے سکون حاصل کر لینے کا طریقہ) خدا کے مقرر کردہ خوشگوار نتائج کا حامل نہیں بن سکتا تھا (اور اسی لئے خدا نے اعلان کر دیا تھا کہ اس نے اس طریق کا حکم نہیں دیا) تو ہمارے ہاں وہی چیز کس طرح حسن نتائج کی کفیل ہو سکتی ہے، خواہ اسے کتنا ہی درست کیوں نہ کر لیا جائے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انفرادی پرستش تعلق باللہ کا ذریعہ بنتی ہے۔ سو سب سے پہلے تو یہ دیکھنا چاہئے کہ تعلق باللہ سے مفہوم کیا ہے؟ اگر مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے دل میں یہ محسوس کرنے لگ جائے کہ اس کا خدا سے تعلق پیدا ہو رہا ہے تو اس انفرادی احساس کو نماز ہی کے ساتھ کس طرح وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ ہر مذہب کا پیرو اس کا مدعی ہے کہ خدا کی عبادت یا ایشور کی بھگتی سے

اس کا احساس ہو جاتا ہے کہ ہمارا تعلق خدا یا الشعور پر پاتما سے پیدا ہو رہا ہے۔ اس سے بھی نزدیک آئیے تو ہمارے ہاں ہر پیر پرست اس کا مدعی ہوتا ہے کہ ان اوراد و وظائف سے جو اس کا پیر باطنی طور پر بتاتا ہے، تعلق باللہ قائم ہو جاتا ہے۔ آپ یہ تو کہہ نہیں سکتے کہ تعلق باللہ کے متعلق ان کا دعویٰ غلط ہے اور آپ کا دعویٰ صحیح ہے۔ جب دعوے کا ثبوت، اپنے اپنے دل کا احساس ٹھہرا تو آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ دوسرے کے احساس قلب کے متعلق فیصلہ کر دیں کہ وہ باطل کا احساس ہے۔ لہٰذا تعلق باللہ کا یہ مفہوم ہی غیر قرآنی ہے اور اسی سے دنیا میں باطل مذہب پرستی کا وجود قائم ہے۔ انسان اور خدا کے تعلق کا ذریعہ ایک ہی ہے اور وہ ہے وحی کا ذریعہ۔ یہ وحی آج اس آسمان کے نیچے صرف قرآن کے اندر ہے۔ اس لئے تعلق باللہ کا ذریعہ فقط قرآن ہے۔ جب ہم قرآن کی اتباع کرتے ہیں تو ہمارا تعلق خدا سے قائم ہو جاتا ہے۔ اب رہا یہ کہ ہم قرآن کی اتباع بھی صحیح طور پر کر رہے ہیں یا نہیں تو اس کا معیار وہ نتائج ہیں جو خود قرآن نے اپنی اتباع کا لازمی ثمرہ بتائے ہیں۔ یہ ہے صحیح تعلق باللہ! اگر قرآن درمیان میں نہ رہے تو کوئی انسان خدا سے اپنا تعلق پیدا نہیں کر سکتا۔ (اسی قسم کے براہِ راست تعلق کا ذریعہ نبوت تھی جس کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے)

اب اس کے بعد وہ سوال سامنے آتا ہے جو ہر اس شخص کے لئے ایک دشوار مرحلہ بن جاتا ہے جو مسلمانوں کی موجودہ روش میں صحیح تبدیلی کا آرزومند ہوتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو کچھ مذہب کے نام پر ہو رہا ہے وہ ان نتائج کا حامل نہیں جنہیں قرآن، اسلامی زندگی کا لازمی نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اور جو کچھ از روئے قرآن ہونا چاہئے وہ اس وقت موجود نہیں۔ (اگر اس کے لئے آج سے کوشش بھی شروع کر دی جائے تو بھی اس کے لئے ایک عرصہ درکار ہے) لہٰذا اس درمیانی عرصہ میں کیا کیا جائے؟ کیا جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہونے دیا جائے یا اسے چھوڑ دیا جائے اور قرآنی نظامِ زندگی کے قیام کی کوشش کی جائے۔ یہ سوال فی الواقعہ ایسا ہے جو ہر اس شخص کے ذہن میں پریشانیاں پیدا کر دیتا ہے جس کا دل صحیح قرآنی انقلاب کا متمنی ہو۔ دنیا میں انقلاب کی آرزو رکھنے والوں میں اکثر ایسے لوگ شامل ہوتے ہیں جن کا ماضی اس ماحول سے وابستہ ہوتا ہے جس سے وہ خود نکلنا اور دوسروں کو نکالنا چاہتے ہیں اور ان کی توقعات اس مستقبل سے وابستہ ہوتی ہیں جس کی تعمیر کے لئے وہ کوشاں ہوتے ہیں۔ لہٰذا انہیں ایک مدت تک اس برزخی کشمکش میں رہنا پڑتا ہے یعنی ان کے دامن کا ایک سرا ماضی سے بندھا رہتا ہے اور دوسرا مستقبل سے منوط۔ ان میں سے اکثر تو اس جگر سوز اور جانکاہ کشمکش کی تاب نہ لا کر پھر سے ماضی کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں یہ توفیق ارزانی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ماحول سے کٹ کر کافۃً اس مستقبل کے ساتھ وابستہ ہو جائیں جو ان کی امیدوں کا مرکز ہوتا ہے۔ اس برزخی مقام میں جی یہ چاہتا ہے کہ ماضی سے تعلق بھی یکسر منقطع نہ ہو اور مستقبل بھی قریب آتا چلا جائے۔ لیکن انقلاب کا فرشتہ بڑا سخت گیر واقع ہوا ہے وہ مفاہمت (Compromise) تو جانتا ہی نہیں۔ اس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس کا اعلان کر دو کہ

انی وجھت وجھی للذی فطر السمٰوٰت والارض حنیفا وما انا من المشرکین۔

میں نے ہر طرف سے اپنا تعلق منقطع کر کے، اپنا رخ خالصۃً اس خدا کے قانون کی طرف پھیر لیا جو فاطر السمٰوات والارض ہے اور اس طرح میں نے شرک کی رگِ حیات کو کاٹ دیا۔

وہ اس اعلان سے ورے اور کسی اعلان کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک

اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

لہٰذا جو لوگ آج ہم میں قرآنی نظامِ زندگی کو بارِ دیگر متشکل دیکھنے کے آرزومند ہیں اور اس انقلاب کے داعی ہیں انھیں اس اہم سوال کے متعلق ایک ہی مرتبہ فیصلہ کرلینا ہوگا۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ قرآن نہیں ہے تو انھیں بے لاگ لپیٹ، کھلے کھلے الفاظ میں اس کا اعلان کرنا ہوگا خواہ اس میں (اور تو اور) خود اپنے ذاتی جذبات بھی کیسے ہی مجروح کیوں نہ ہوں۔ اور اگر وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں کتربیونت سے قرآنی نظامِ زندگی پیدا ہوجائے گا تو (کم ازکم ہم تو اپنی حقیر سی بصیرت کے مطابق اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ) اس سے قرآنی انقلاب کبھی نہیں آسکے گا۔

لیکن اس کے ساتھ ہی طلوع اسلام ایک اور بات بھی کہتا ہے۔ جو کچھ ہمارے ہاں مذہب کے نام پر ہو رہا ہے اس نے اپنی دینی حیثیت تو کھو دی ہے لیکن وہ ہمارا قومی شعار سا بن چکا ہے۔ مثلاً سب سے پہلے اس کلمہ کو لیجئے جو دین کی بنیاد ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ دین کی رو سے اس کے معنی یہ ہیں کہ "میں اس حقیقت کبریٰ کا اعلان کرتا ہوں کہ کائنات میں خدا کے قانون و اقتدار کے علاوہ اور کسی کا قانون و اقتدار کارفرما نہیں اس لئے میری زندگی بھی اسی قانون کے تابع رہے گی۔ میں اس کے سوا کسی اور قانون اور اقتدار کو تسلیم نہیں کروں گا۔ اور یہ قانون ہمیں رسالت محمدیہ کی وساطت سے ملا ہے جو قرآن کے اندر محفوظ ہے"۔ یہ ہے کلمہ کا مفہوم دین کی رو سے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ کلمہ اپنا دینی مفہوم کھو چکا ہے۔ لیکن یہ ہمارا اس قسم کا قومی شعار بن چکا ہے کہ جو شخص اس کلمہ کا اقرار کرتا ہے اسے ہم مسلمانوں کے گروہ کا ایک فرد سمجھتے ہیں اور جو اس سے انکار کرتا ہے اسے ہم اس گروہ سے باہر قرار دیتے ہیں۔ اسی کلمہ کا اشتراک ہے کہ (اگرچہ غیر قرآنی تصوراتِ حیات کے ماتحت دنیا کے مسلمان قوموں، نسلوں، جغرافیائی حدبندیوں اور سیاسی تقسیموں کے مطابق الگ الگ ٹکڑیوں میں بٹ چکے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ) دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے مسلمان اپنے اندر ایک غیر مرئی سی وحدت محسوس کرتے ہیں۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ یہ کلمہ ہمارا قومی شعار بن چکا ہے۔ یہی حیثیت دینی ارکان، مثلاً نماز، روزہ، حج زکوٰۃ وغیرہ کی ہے۔ یہ سب اپنی دینی معنویت سے محروم ہوچکے ہیں لیکن یہ ہمارے قومی شعائر بن گئے ہیں۔ چونکہ قومی شعائر بھی ایک حد تک افراد میں احساسِ یگانگت کے زندہ رکھنے کا موجب ہوتے ہیں . . . .

. . . . اسلئے طلوع اسلام کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ (اس دوران میں جبکہ ہم صحیح قرآنی معاشرہ کی تشکیل کے لئے جدوجہد کریں) یہ قومی شعائر اسی طرح آگے منتقل ہوتے رہیں (بجز ان کے جن کی سند قرآن میں نہیں) اس سے (جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے) مختلف افراد میں کچھ نہ کچھ احساس یگانگت تو باقی رہے گا۔ اگر ہم قرآنی معاشرہ کی تشکیل میں کامیاب ہوگئے تو یہی قومی شعائر دینی ارکان بن جائیں گے اور ان سے وہی نتائج مرتب ہونے لگ جائیں گے جن کی وضاحت قرآن نے کی ہے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے پیش نظر طلوع اسلام ان شعائر کو باقی رکھنے کے حق میں ہے اور انھیں مٹانے اور ان میں ردوبدل کرنے سے قوم میں تشتت و انتشار پیدا کرنے کو سختی سے روکتا ہے۔ ہم سے پہلے جن حضرات نے قرآن کی طرف

دعوت دینے کی جدوجہد کی (خدا انھیں ان کی نیک نیتوں اور حسن مساعی کا اجر دے) ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے پیش نظر قرآنی معاشرہ کی تشکیل نہیں تھی۔ وہ صرف موجودہ (غیر قرآنی) فقہ کو قرآنی فقہ سے بدلنا چاہتے تھے۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا (جیسا کہ ہونا چاہئے تھا) کہ معاشرہ میں کوئی تبدیلی تو واقع ہوئی نہ، اور قوم میں مزید تفرقہ پڑ گیا۔ طلوع اسلام کے پیش نظر قرآنی معاشرہ کی تشکیل ہے۔ اگر قرآنی معاشرہ قائم ہو گیا تو وہ اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق فقہی جزئیات میں خود بخود ضروری تبدیلیاں کر لے گا۔ یہ کام ہمارے کرنے کا نہیں ہے۔

یہ وجہ ہے کہ طلوع اسلام موجودہ مذہبی ارکان کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنا چاہتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی دہرائے جاتا ہے کہ ان کی حیثیت محض ہمارے قومی شعائر کی ہے۔ انھیں دینی حیثیت اس وقت حاصل ہوگی جب ان سے وہ نتائج مرتب ہونے لگ جائیں گے جن کی صراحت قرآن نے کر دی ہے اور یہ چیز اس وقت تک ممکن نہیں جب تک معاشرہ کی تشکیل قرآنی خطوط پر نہ ہو جائے۔ قرآن نے جب کتاب کے ساتھ حکمت کو بھی منزل من اللہ قرار دیا ہے (یعنی اللہ نے قرآن میں کتاب اور حکمت دونوں کو نازل کیا ہے) تو اس سے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کتاب کے معنی ہیں قانون اور حکمت کے معنی ہیں اس قانون کی غایت (THE WHY OF IT) یعنی اس نے کہا ہے کہ "یہ کرو تاکہ یہ ہو جائے"۔ "یہ کرو" قانون ہے اور "تاکہ یہ ہو جائے" اس قانون کی حکمت ہے۔ اسی کو قانون کے نتائج کہتے ہیں۔ لہٰذا، قرآن نے جہاں قانون کو خدا کی طرف سے دیا ہے، اس کے ساتھ ہی ان نتائج کو بھی خود ہی بیان کر دیا ہے جن کا حامل وہ قانون ہے۔ یہ اس لئے کیا ہے تاکہ ہم ایک ایک قدم پر اس کا جائزہ لیتے رہیں کہ ہم قانون کی صحیح صحیح پیروی کر رہے ہیں یا نہیں۔ اگر اس قانون کے اتباع سے وہی نتائج مرتب ہو رہے ہیں جن کی صراحت قرآن نے کر دی ہے تو سمجھ لیجئے کہ قانون کی ٹھیک ٹھیک اطاعت ہو رہی ہے۔ لیکن اگر اس سے وہ نتائج مرتب نہیں ہو رہے تو پھر یقین کر لیجئے کہ اس کی اطاعت ٹھیک نہیں ہو رہی۔ (خواہ آپ بزعم خویش اس کی اطاعت کیسی ہی عمدگی سے کیوں نہ کر رہے ہوں اور اس سے آپ کے جذبات کی تسکین کیسی ہی اچھی کیوں نہ ہو جاتی ہو) پہلی قومیں اسلئے تباہ نہیں ہوئی تھیں کہ انھوں نے اپنے دینی احکام سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اس لئے تباہ ہوئی تھیں کہ وہ جس انداز سے ان احکام کی اتباع کرتے تھے اس سے وہ نتائج مرتب ہوتے نہیں تھے جن کے لئے وہ احکام دیئے گئے تھے لیکن اس کے باوجود وہ سمجھتے یہ تھے کہ ہم ان احکام کی اطاعت ٹھیک ٹھیک کر رہے ہیں۔ مثلاً (قرآن اس پر شاہد ہے کہ) انبیائے بنی اسرائیل نے اپنی قوم کو "قیام صلوٰۃ" کا حکم دیا تھا۔ یہودی آج تک برابر نماز پڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ عیسائی بھی نماز پڑھتے ہیں۔ باور کیا جا سکتا ہے کہ ان کی موجودہ نماز کی شکل وہی ہے جو ان کے اس ابتدائی معاشرہ میں رائج تھی جب یہ کتاب اللہ پر ٹھیک ٹھیک عمل کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن کہتا ہے کہ انھوں نے "صلوٰۃ کو ضائع کر دیا" (اضاعوا الصلوٰۃ) اور اس طرح تباہ و برباد ہو گئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صلوٰۃ کی شکل قائم رکھنے کے باوجود ان سے کیا غلطی ہوئی تھی جس کی وجہ سے قرآن نے کہا ہے کہ انھوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا۔ غلطی یہ ہوئی تھی کہ انھوں نے اس کا جائزہ نہیں لیا کہ ان کی صلوٰۃ وہ نتائج مرتب کر رہی ہے یا نہیں جن کی

صراحت خدا نے کی تھی۔ ان کی صلوٰۃ نے وہ نتائج اس وقت سے مرتب کرنے چھوڑ دیئے تھے جب سے انھوں نے صلوٰۃ کو دینی معاشرہ کے بجائے انفرادی دعا (یا پرستش) سمجھ لیا۔ چنانچہ ان کے ہاں صلوٰۃ کے لئے لفظ بھی دعا (PRAYER) یا پرستش (WORSHIP) کا استعمال ہوتا ہے [بعینہ یہی پوزیشن ہماری نماز کی ہو چکی ہے جسے ہم "انفرادی صلوٰۃ" کہتے ہیں]۔

لہٰذا یہ دیکھنے کے لئے کہ ہمارے مذہبی ارکان، دین کے اجزا بن چکے ہیں یا نہیں، ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ان سے وہ نتائج مرتب ہو رہے ہیں یا نہیں جن کی تفصیل قرآن نے خود دیدی ہے، جب تک وہ نتائج مرتب نہیں ہوتے ان ارکان کی دینی حیثیت کچھ نہیں رہتی۔ یہ صرف قومی شعائر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

اب آیئے اس سوال کی طرف جو ہم سے اکثر (اعتراضاً اور بعض اوقات طعناً) پوچھا جاتا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ طلوع اسلام نے جب سے "نظام صلوٰۃ" کی آواز بلند کی ہے لوگوں کے دلوں میں مروجہ نماز کی اہمیت کم ہو گئی ہے حتیٰ کہ مسجدوں میں نمازی کم ہوتے جا رہے ہیں۔[1] سب سے پہلے ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں طلوع اسلام کی آواز کو حقیقت سے زیادہ اہمیت دی جا رہی ہے۔ اگر ان حضرات کے نزدیک طلوع اسلام کی آواز کا اثر یہی ہے کہ اس سے مروجہ نماز کی اہمیت کم ہو جاتی ہے تو بھی یہ کہنا مبالغہ ہے کہ یہ اس آواز کا اثر ہے کہ مسجدوں میں نمازی کم ہوتے جا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ارباب مذہب کا شروع سے یہ انداز چلا آ رہا ہے کہ اگر لوگ ان کے کسی عقیدہ یا مسلک سے بے اعتنائی برتنا یا برگشتہ ہونا شروع کرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ یہ سوچیں کہ اس عقیدہ یا مسلک میں کیا خرابی ہے جس کی وجہ سے اس نے اپنی جاذبیت کھو دی ہے، ان کی نگاہ ہمیشہ اس طرف جاتی ہے کہ اس کا الزام کس کے سر تھوپا جائے؟ چنانچہ وہ آسانی سے "شریعت حقہ" کے اس مخالف کو تلاش کر لیتے ہیں اور اسے ملحد و بے دین قرار دیکر عوام کو اس کے پیچھے لگا دیتے ہیں اور بزعم خویش مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس سے اس عقیدہ یا مسلک کی گرتی ہوئی عمارت کی روک تھام ہو گئی ہے۔ یہی کچھ آجکل ہو رہا ہے۔ ہمارا نوجوان طبقہ، ہمارے فرسودہ (اور انسانوں کے خود ساختہ) مذہب سے بیزار اور اس مذہب کے حاملین کے کردار سے متنفر ہوتا جا رہا ہے اور یہ حضرات بجائے اس کے کہ اپنے مزعومات و اعمال کا جائزہ لیں، یہ کہہ کر دوسروں کو (اور شاید اپنے آپ کو بھی) فریب دے لیتے ہیں کہ ان میں تو کوئی نقص نہیں۔ یہ سب کچھ طلوع اسلام کی "فتنہ پردازی" کا اثر ہے۔

بات یہ ہے کہ مذہب ہو یا زندگی کا کوئی اور گوشہ، انسان ان اعمال پر جن کا کوئی نتیجہ سامنے نہ آتا ہو صرف اسی وقت تک کاربند رہ سکتا ہے جب تک اس کے دل میں یہ کاوش نہ پیدا ہو کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں اس کا بالآخر نتیجہ کیا ہے۔ ہمارے اس دور میں (متعدد وجوہات کی بنا پر) یہ سوال ابھر کر سامنے آنا شروع ہو گیا ہے کہ ہر عمل کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ہونا ضروری ہے۔ ایک تو سائنس کی بڑھتی ہوئی تحقیقات جس نے قدم قدم پر یہ بتانا شروع کر دیا کہ کائنات میں ایک پتہ کی جنبش بھی بلا نتیجہ نہیں رہتی۔ دوسرے اقوام مغرب

---

[1] اس کے متعلق سابقہ اشاعت کے باب المراسلات میں بھی مختصراً لکھا جا چکا ہے۔

کی فتوحات جن سے مغلوب اقوام یہ سوچنے پر مجبور ہوگئی ہیں کہ اقوام مغرب کی طاقت کا راز کیا ہے۔ جہانتک پاکستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے، ان اسباب میں ایک اور سبب کا بھی اضافہ ہوا ہے تقسیم ہند سے پہلے کی زندگی میں مسلمانوں کے سامنے اپنی تحفظ ذات کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہاں ہم یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہندوستان اور اس کے باشندوں کی حفاظت کی ذمہ داری انگریز کے سر ہے اس لئے ہمیں اس کی کاوش ہی نہیں ہوتی تھی کہ زمانہ کا رخ کس سمت کو ہے اور ہمارے سامنے کون کون سے خطرات ہیں۔ تشکیل پاکستان کے بعد یہ صورت حالات یکسر بدل گئی۔ اب کیفیت یہ ہے کہ کہیں پتہ بھی کھڑکے تو ہمیں خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کی زد ہم پر ہی نہ ہو۔ ان حالات میں ہر وہ شخص جس کے دل میں تحفظ ذات کا ذرا سا بھی احساس ہے یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ آپ نے غور کیا ہوگا کہ اب لوگوں کو لیڈروں کی تقریریں، بیانات، وعدے، یا مختلف جماعتوں کے رزولیوشن حتیٰ کہ حکومت کی منصوبہ بندیاں (PLANS) بالکل مطمئن نہیں کر سکتے۔ ہر شخص یہ پوچھتا ہے کہ ہمیں بتاؤ کہ جو کچھ تم کہتے یا کرتے ہو اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ ظاہر ہے کہ جب تمام فضا اس قسم کے خیالات سے معمور ہو جائے تو پھر مذہبی اعمال کے متعلق بھی ضرور یہ خیال پیدا ہوگا کہ بالآخر ان کا نتیجہ کیا ہے؟ ملا کی طرف سے اس سوال کا جواب یہ ملتا ہے کہ ان اعمال سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس جواب سے اس زمانے کے انسان کا اطمینان نہیں ہوتا۔ اول تو اس کے نزدیک اس طرح کا خدا کا تصور جیسا ملا پیش کرتا ہے ایک مستبد حاکم کا تصور ہوتا ہے جو محض اپنی خوشنودی کے لئے لوگوں سے ایسے کام کرائے جن کا نتیجہ بجز اس کی خوشی کے اور کچھ نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اس سے اس دور کا نوجوان یہ سوچنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ عجیب تماشا ہے کہ جو لوگ خدا کی خوشنودی حاصل کر رہے ہیں وہ دنیا میں سب سے زیادہ پست اور ذلیل ہیں، اور جو اقوام خدا کی ہستی تک کی بھی قائل نہیں وہ دن بدن قوت اور سطوت حاصل کئے جا رہی ہیں۔ چونکہ ہمارے نوجوان طبقہ کو مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ان سوالات کا اطمینان بخش جواب نہیں ملتا، وہ مذہبی اعمال کو چھوڑتا جا رہا ہے۔ یہ ہے اصل وجہ اس حقیقت کی کہ ——— مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے ——— اس کی وجہ طلوع اسلام نہیں۔ آپ کو لاکھوں کی تعداد میں وہ نوجوان ملیں گے جنھوں نے آج تک طلوع اسلام کا نام تک بھی نہیں سنا لیکن وہ بھی ان مذہبی اعمال سے برگشتہ ہو چکے ہیں۔ طلوع اسلام کا اتنا ہی قصور ہے کہ اس نے قوم کے سامنے قرآن کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ انھیں قرآن کے ایک ایک صفحہ پر یہ لکھا ملتا ہے کہ ہر عمل کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ قوموں کا عروج و زوال ان کے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتا ہے جنھیں مذہبی اعمال کہا جاتا ہے ان کا نتیجہ بھی اسی طرح مرتب ہوتا ہے جس طرح دیگر اعمال کا۔ ذلت اور رسوائی خدا کا عذاب ہے۔ عزت اور قوت، دولت اور حشمت اس کی نعمت ہے۔ انسانی اعمال کے نتائج اس دنیا کی زندگی میں بھی سامنے آتے ہیں اور انہی اثرات کا سلسلہ مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی مسلسل قائم رہتا ہے۔ طلوع اسلام نے اتنا ہی کہا ہے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ اگر طلوع اسلام قرآن کو اس طرح کھول کر سامنے نہ رکھ دیتا تو لوگوں کے دل میں یہ تجسس اور کاوش پیدا نہ ہوتی تو طلوع اسلام بیشک اپنے اس جرم کا اقبالی ہے۔ اس کے بعد سوچنے کی بات یہی رہ جاتی ہے کہ کیا قرآن کو بند کر دیا جائے تاکہ مسلمان بدستور (قرآن کی طرف سے جہالت کی بنا پر) بے نتیجہ مذہبی اعمال پر کاربند رہیں

یا قرآن کو اس وضاحت سے پھیلایا جائے تاکہ لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ ان بے نتیجہ اعمال میں قرآنی نتائج کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں؟ اس باب میں ہم صرف اتنا عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر ہم نے قرآن کو بند کر دیا تو جو طبقہ زمانہ کے تقاضوں سے موجودہ بے نتیجہ مذہبی اعمال سے برگشتہ ہو چکا ہے، ان سے برگشتہ ہی رہے گا اور ان کے ساتھ اور لوگ بھی ملتے چلے جائیں گے (کیونکہ آپ اپنی خوش فہمیوں سے زمانے کے دھارے کو موڑ نہیں سکتے) لیکن اس کے ساتھ یہ طبقہ قرآن سے بھی برگشتہ ہو جائے گا (جیسا کہ اسوقت بھی ایک طبقہ موجود ہے جو موجودہ نماز روزہ ہی سے برگشتہ نہیں بلکہ خدا اور وحی تک سے برگشتہ ہو رہا ہے) لیکن اگر آپ نے ان کے سامنے قرآن کو کھول کر رکھ دیا تو اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اسلام سے برگشتہ نہیں ہوں گے، کیونکہ قرآن میں اتنی قوت ہے کہ وہ اس قسم کے برگشتہ ہونے والوں کو تھام لے۔ اس نازک دور میں طلوعِ اسلام کی یہی کوشش ہے۔ باقی اگر کوئی کہتا ہے کہ میں نے موجودہ مذہبی اعمال (نماز روزہ وغیرہ) کو اسلئے چھوڑا ہے کہ طلوعِ اسلام ایسا کہتا ہے تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔ وہ خود ہی ان اعمال کو چھوڑنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی بزدلی ہے کہ وہ اس کا کھلے بندوں اقرار نہیں کرتا اور طلوعِ اسلام کی آڑ میں چھپنا چاہتا ہے۔ یہ لوگ ان شعائر سے اسلئے بھی بے اعتنائی برتتے ہیں کہ اس سے ان پر کوئی مواخذہ نہیں ہوتا۔ ذرا ان سے کہئے کہ وہ اس کی جرأت کر کے دکھائیں کہ جب پاکستان کا جھنڈا بلند کیا جائے تو وہ اٹھ کر کھڑے نہ ہوں! پاکستان کے جھنڈے کی حیثیت بھی تو قومی شعار ہی کی ہے۔ بہرحال جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے طلوعِ اسلام ان قومی شعائر کو علیٰ حالہ قائم رکھنا چاہتا ہے اور ان سے ہٹنے کا کبھی مشورہ نہیں دیتا (بجز ان کے جن کی اصل و بنیاد ہی قرآن میں نہیں)۔

پاکستان کا آئین

آجکل پھر مجلس دستور ساز کے زیرِ غور ہے اور پھر یہ بحث ہو رہی ہے کہ اس آئین کو کیسا ہونا چاہئے۔ اسلامی آئین کسے کہتے ہیں۔ نظامِ شریعت سے کیا مراد ہے؟ "قرآن و سنت" کی صحیح تعبیر کون کر سکے گا۔ یقیناً یہ مسائل بڑے اہم ہیں۔ اگر آپ انھیں از خود سمجھنا چاہتے ہیں تو ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ دو کتابوں کا ضرور مطالعہ کیجئے۔

(۱) اسلامی نظام

جسمیں بتایا گیا ہے کہ کتاب و سنت کا صحیح مفہوم کیا ہے اور اس کی روشنی میں اسلامی نظام کس طرح مرتب ہو سکتا ہے۔ ضخامت ۱۸۴ صفحات قیمت دو روپے علاوہ محصولڈاک

(۲) قرآنی دستورِ پاکستان

جس میں حکومت کی قراردادِ مقاصد، بنیادی کمیٹی کی رپورٹ۔ مولوی صاحبان کے نکات۔ جماعت اسلامی کی طرف سے پیش کردہ سفارشات وغیرہ پر بے لاگ تنقید کی گئی ہے اور خود طلوعِ اسلام کی طرف سے قرآنی آئین کا مسودہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ ضخامت ۲۲۴ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصولڈاک

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ کوی روڈ۔ نزد پیراڈائز سنیما۔ کراچی

باب المراسلات

نزولِ حضرت عیسیٰؑ

ایک صاحب ارشاد فرماتے ہیں:-

علامہ تمنا کی تنقیدات (احادیث نزول مسیح کے متعلق) کے بارے میں میری رائے ہے کہ یہ سلسلہ ختم ہو جائے تو اسے یکجائی پمفلٹ کی صورت میں شائع کر کے گھر گھر پہنچا دینا چاہیئے۔ لیکن بہتر یہ ہوگا کہ اسے پرویز صاحب کی طرح سہل اور سمجھ میں جلد آنے والے تسلسل و ترتیب کے ساتھ لکھا جائے بلکہ عقیدۂ نزول مسیح کے متعلق قرآنی اور عقلی نقطۂ نظر سے ایک دو اور بھی سہل الفہم اور قوی الدلیل مقالے بھی ساتھ ہونے چاہئیں۔ اس پمفلٹ کے فوائد کا صحیح اندازہ اسوقت ہم آپ نہیں کر سکیں گے لیکن یہ ایک بڑی انقلابی چیز ہوگی اور آئندہ نسلیں اس سے بڑا فائدہ اٹھائیں گی اور آئندہ مہدویت و مسیحیت کے دروازے بند ہو جائیں گے اور مرزائیت کی اصل و بنیاد ہمیشہ کیلئے منہدم ہو جائے گی۔ مجھے امید ہے کہ آپ اور حضرت پرویز میری رائے کی اہمیت کو ضرور محسوس فرمائینگے صرف اسی قدر نہیں بلکہ میری رائے ہے کہ اس پمفلٹ کا عربی، فارسی اور انگریزی ترجمہ بھی ضرور شائع ہونا چاہیئے۔ اس انتظار مسیح و مہدی کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے ختم کیجئے اور اس مقصد کیلئے جتنے علمی اور پروپیگنڈائی پہلو ہو سکتے ہیں وہ سب عمل میں لائیے۔ والسلام

اس میں شبہ نہیں کہ جن غیر قرآنی معتقدات و تصورات نے اسلام کو بڑا ضعف پہنچایا ہے ان میں نزول حضرت عیسیٰؑ کا عقیدہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ تیرہ سو سال سے عیسائی، اسی عقیدہ کی بنا پر نبی اکرمؐ پر حضرت عیسیٰؑ کی افضلیت ثابت کرتے چلے آئے اور اس کے بعد، انگریزوں کی عیسائی حکومت نے، اسی عقیدہ سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کو ایک "مثلِ مسیح" دیدیا جس نے جہاد کو حرام قرار دیا اور ہر غیر مسلم حکومت سے وفاداری کو عین اسلام ٹھہرایا۔ علاوہ بریں اس عقیدہ نے خود ختم نبوت جیسے مسلمہ اور واضح اصولِ دین کو بھی جسقدر ضعف پہنچایا ہے وہ کم افسوسناک نہیں۔ اس عقیدہ کی رو سے مانا یہ جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ کے بعد ایک اور نبی آنے والا ہے۔ وہ نبی حضرت عیسیٰؑ ہیں جو اسوقت چوتھے آسمان پر زندہ موجود ہیں اور قیامت کے قریب آسمان سے نازل ہوں گے۔ لیکن وہ اپنی شریعت کو ساتھ نہیں لائیں گے بلکہ شریعتِ محمدیہ کے تابع ہوں گے۔ اس سے ظاہر ہے کہ خود مسلمانوں کے اس (غیر قرآنی) عقیدہ کے بموجب، رسول اللہؐ کے بعد ایک نبی آسکتا ہے لیکن وہ نبی صاحب شریعت نہیں ہو سکتا۔ اسے شریعتِ محمدیہ ہی کی اتباع کرنی ہوگی۔ میرزا غلام احمد نے مسلمانوں کے اسی (غیر قرآنی) عقیدہ سے فائدہ اٹھایا اور تھوڑی سی تبدیلی سے (جو معقولیت پر مبنی نظر آتی تھی) اپنے "مثلِ مسیح" ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ میرزا صاحب نے کہا کہ

(۱) مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے دنیا میں آنا ہے۔

(۲) لیکن حضرت عیسیٰؑ وفات پا چکے ہیں۔ اس لئے ان کا زندہ آسمان پر ہونا اور پھر بجسدِ عنصری آسمان سے زمین پر نازل ہونا

مرتجا غلط ہے: لہذا

(۳) آنے والا خود (حضرت) عیسیٰ مسیح ابن مریم نہیں بلکہ ان کا مثیل ہوگا۔

(۴) وہ نبی ہوگا لیکن صاحب شریعت نہیں ہوگا۔ شریعتِ محمدیہ کے تابع

(۵) اور وہ "مثیلِ مسیح" میں ہوں۔

آپ نے غور فرمایا کہ نزولِ مسیح کے (غیر قرآنی) عقیدے کے بعد میرزا صاحب کے دعوے کا صغری کبری کس طرح ٹھیک بیٹھ جاتا ہے؟ انھوں نے اس مروجہ عقیدہ میں اتنی تبدیلی کی کہ حضرت عیسیٰ آسمان پر زندہ موجود نہیں وہ وفات پا چکے ہیں۔ اور جو وفات پا جائے وہ دنیا میں واپس نہیں آیا کرتا۔ یہ تبدیلی قرآن کے مطابق تھی اور قرینِ عقل بھی۔ اسلئے جب نزولِ مسیح کے (غیر قرآنی) عقیدہ کو اس (قرآنی) تبدیلی کے ساتھ پیوست کر دیا گیا، تو اس کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ وہ آنے والا مسیح آسمان سے نازل نہیں ہوگا۔ عام طریق سے پیدا ہوگا۔ اور (عام عقیدے کے مطابق) وہ صاحب شریعت نہیں ہوگا بلکہ شریعتِ محمدیہ کے تابع ہوگا۔ چنانچہ جتنے لوگ نزولِ مسیح کے عقیدے کے قائل تھے لیکن (سرسید وغیرہ کے اثر کے ماتحت، شعوری یا غیر شعوری طور پر) حضرت عیسیٰ کی حیات کے قائل نہیں تھے، انھیں میرزا صاحب کی یہ "معجون مرکب" بہت پسند آئی اور لوگ دھڑا دھڑ میرزائی ہونا شروع ہو گئے۔ مولوی صاحبان نے جب اس کی مخالفت شروع کی تو لوگوں نے دیکھا ہر مباحثہ کے بعد فضا کے اثرات میرزا صاحب کے حق میں جاتے تھے۔ اس طرح کہ

(۱) مولوی صاحبان یہ مانتے تھے کہ حضرت عیسیٰ نے آنا ہے لہذا اس باب میں وہ میرزا صاحب سے متفق تھے۔

(۲) مولوی صاحبان مانتے تھے کہ عیسیٰ نبی تو ہوں گے لیکن اپنی شریعت کو ساتھ نہیں لائیں گے بلکہ شریعتِ محمدیہ کے تابع تابع ہوں گے اور ان کے اس طرح آنے سے نبوت کی مہر بھی نہیں ٹوٹے گی۔

یہی دعویٰ میرزا صاحب کا تھا کہ میں نبی ہوں لیکن اپنی شریعت نہیں رکھتا میں شریعتِ محمدیہ کے تابع ہوں۔

(۳) اب لے دیکر مختلف فیہ سوال اشارہ جاتا تھا کہ مولوی صاحبان کے نزدیک آنے والے سے مراد حضرت عیسیٰ (ابن حضرت مریم) تھے اور میرزا صاحب کہتے تھے کہ حضرت عیسیٰ وفات پا چکے ہیں لہذا آنے والا مسیح ابن مریم نہیں بلکہ مثیلِ مسیح ہوگا۔

(۴) بنابریں، بحث ساری حیات و وفاتِ مسیح کے مسئلہ پر مرتکز ہو جاتی تھی اور چونکہ وفاتِ مسیح کا تصور قرآن کے بھی مطابق تھا اور قرینِ عقل بھی۔ اس لئے اس بحث کا نتیجہ میرزا صاحب کے حق میں جاتا تھا۔ اور جو شخص وفاتِ مسیح کا قائل ہو جاتا تھا وہ پھر نزولِ مسیح کے بجائے "مثیلِ مسیح" کی آمد کا خود بخود قائل ہو جاتا تھا۔ اور یوں مرزا صاحب کا دعویٰ سچا نظر آنے لگ جاتا تھا۔ یہ وجہ تھی (اور اب تک یہی وجہ ہے) کہ میرزائی حضرات ہمیشہ حیات و وفاتِ مسیح کے مسئلہ کو اپنی بحث کا مرکز بناتے ہیں اور دیگر مسائل کو پیچھے رکھتے ہیں۔

اس بحث میں ایک چیز اور بھی بڑی پر لطف ہوتی تھی۔ میرزا صاحب آمدِ مسیح کے عقیدے کو حدیثوں سے ثابت کرتے تھے (بلکہ

یوں کہئے کہ فریقِ مقابل سے اس عقیدے کا اعتراف کرا لیتے تھے۔ اس لئے کہ فریقِ مخالف اس عقیدے کا پہلے ہی سے قائل ہوتا تھا)۔ اس کے بعد وفاتِ مسیح کو قرآن سے ثابت کرتے تھے جب فریقِ مخالف حیاتِ مسیح کو حدیثوں سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا تو میرزا صاحب کہہ دیتے کہ جو بات قرآن سے ثابت ہو جائے اس کے بعد جو حدیث اس بات کے خلاف جائے اسے غلط سمجھنا چاہیئے یا اس کی تاویل ایسی کرنی چاہیئے جس سے وہ قرآن سے منطبق ہو جائے۔ اس باب میں بھی مولوی صاحبان کو خاموش ہونا پڑتا تھا اور اگر وہ اپنے دعوے پر اڑے رہتے تو معقولیت پسند آدمی یہی کہتا کہ میرزا صاحب کی بات سچی ہے۔ جب ایک بات قرآن سے ثابت ہو جائے تو پھر جو حدیث اس کے خلاف نظر آئے اسے یا تو ضعیف سمجھنا چاہیئے یا اس کی تاویل ایسی کرنی چاہیئے جو قرآن کے مطابق ہو۔

آپ تصریحات بالا پر ایک مرتبہ پھر غور کیجئے اور دیکھئے کہ کیا میرزائیت کا سارا مسئلہ نزولِ حضرت عیسیٰؑ ہی کے گرد نہیں گھومتا؟ اور اس کے بعد یہ سوچئے کہ جب تک مسلمانوں میں یہ (غیر قرآنی) عقیدہ قائم رہے گا میرزائیت (یا اسی قسم کی اور تحریکوں) کے خاتمے کی کوئی امید بھی کی جا سکتی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ ہمارے مولوی صاحبان پچاس برس سے میرزائی حضرات کے ساتھ بحث مباحثوں میں الجھے چلے آ رہے ہیں لیکن یہ مسئلہ بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح اسی مقام پر گردش کر رہا ہے۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ (غیر قرآنی) عقیدہ کس قدر تباہیوں کا موجب ہے اور اس سے ملت کا کتنا بڑا نقصان ہو رہا ہے۔

اس عقیدہ کے ازالہ کا ایک انداز تو وہ ہے جسے علامہ تمنا عمادی نے اختیار کیا ہے۔ یعنی وہ حدیث کو دین ماننے والوں کو بتاتے ہیں کہ جن احادیث پر عقیدۂ نزولِ مسیحؑ کی بنیاد ہے وہ حدیثیں خود تمہارے اپنے مقرر کردہ معیاروں کے مطابق ضعیف ہیں۔ لہٰذا یہ عقیدہ ازروئے احادیث بھی درست نہیں۔ ابطال باطل کا یہ انداز بھی اپنی جگہ پر ایک حیثیت رکھتا ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس باب میں آج علامہ موصوف کا کوئی جواب نہیں۔ رجال پر تنقید کے بارے میں ان کی نگاہ کی وسعتیں اور گہرائیاں ہر صاحب بصیرت سے خراجِ تحسین وصول کر لیتی ہیں۔ لیکن (جیسا کہ ہم نے اس سلسلۂ تنقید کے آغاز میں لکھا تھا) یہ عقیدہ بھی اس بنیادی غلطی کا لازمی نتیجہ ہے جس کی رو سے احادیث کے موجودہ مجموعوں کو دین کا جزو قرار دیا جاتا ہے۔ اسے ایک اتفاقی امر سمجھئے یا عدم احتیاط کا نتیجہ کہ جن لوگوں نے نزولِ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق وضعی حدیثیں بنائیں انھوں نے سلسلۂ اسناد میں ایسے راویوں کا نام لکھ دیا جو تنقید کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے لیکن ایسی حدیثیں بھی تو ہو سکتی ہیں جن میں راویوں کا نام لکھنے میں احتیاط سے کام لیا گیا ہو اور وہ تنقیدِ رجال کی میزان میں بالکل ثقہ ثابت ہوتے ہوں۔ لہٰذا اس قسم کی حدیثیں فنِ رجال کے مطابق قوی قرار پائیں گی۔ لیکن اس کے باوجود ان کی بنیادوں پر قائم کردہ کوئی ایسا عقیدہ صحیح قرار نہیں پا سکے گا جو غیر قرآنی ہو۔ لہٰذا اصل بحث مڑ پھر کر یہیں آ جاتی ہے کہ دین کا معیار کیا ہے؟ —— ہمارے نزدیک دین کا معیار فقط کتاب اللہ ہے۔ جو عقیدہ یا تصور اس کے مطابق ہے وہ صحیح ہے اور جو اس کے مطابق نہیں وہ بلا تامل وتذبذب غلط اور باطل ہے۔ (خواہ اس کی تائید میں ہزار حدیثیں بھی ایسی کیوں نہ پیش کر دی جائیں جن کے راویوں میں جبرائیل اور میکائیل تک کا بھی نام شامل کر دیا گیا ہو) جب ہم نزولِ مسیحؑ کے عقیدہ کو قرآن کی رو سے

دیکھتے ہیں تو اس عقیدہ کے غیر قرآنی ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ قرآن کی رو سے

(۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام دیگر انبیاء کرام کی طرح اپنے وقت پر وفات پا گئے، اور

(۲) جو وفات پا جائیں وہ دنیا میں واپس نہیں آیا کرتے۔ اور

(۳) قرآن میں نزولِ عیسیٰؑ کا کوئی ذکر نہیں۔ لہٰذا

(۴) حضرت عیسیٰؑ ابن مریم علیہ السلام کے نزول یا کسی مثیل مسیح کی آمد کا تصور ہی سرے سے غلط ہے۔ بنا بریں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ آنیوالے مرزا صاحب تھے یا کوئی اور صاحب۔

علاوہ بریں قرآن کی رو سے

(۱) کوئی نبی بغیر کتاب (شریعت) کے نہیں آیا کرتا اسلئے یہ تصور ہی باطل ہے کہ کوئی شخص اپنے آپ کو نبی یا رسول بلا کتاب کہے

(۲) لہٰذا یہ عقیدہ بھی غلط ہے کہ آنیوالے حضرت مسیح ابن مریمؑ ہوں یا کوئی مثیل مسیح) نبی تو ہونگے لیکن اپنی شریعت نہیں لائیں گے۔

نیز قرآن کریم کی رو سے خدا کا دین، قرآن میں مکمل ہو چکا ہے اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا ہے اسلئے قرآن کے بعد کوئی کتاب نہیں آسکتی اور جب کتاب نہیں آسکتی تو کسی نبی یا رسول کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جو ایسا دعویٰ کرتا ہے وہ خدا پر افترا باندھتا ہے خواہ وہ ایران کے بہاؤ اللہ ہوں یا پنجاب کے میرزا صاحب! یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کی رو سے نبی اور رسول میں کسی قسم کا فرق نہیں۔ یہ ایک ہی حقیقت کے دو گوشے اور ایک ہی شخصیت کے دو منصب ہیں۔ نبوت کے معنے ہیں خدا سے وحی کا ملنا اور رسالت کے معنی ہیں اس وحی کا دوسروں تک پہنچانا۔ نبوت (یعنی خدا کی طرف سے وحی کا ملنا) نبی اکرم صلعم پر ختم ہو گئی۔ آپ کے بعد کسی کو وحی نہیں مل سکتی۔ باقی رہا فریضۂ رسالت (یعنی قرآن کو دوسروں تک پہنچانا) سو یہ فریضہ اس امت کے سپرد کر دیا گیا ہے جسے خدا نے وراثت کتاب کیلئے منتخب کیا تھا۔

یہ ہے قرآن کی رو سے اس مسئلہ کا حل جس میں کہیں کوئی پیچ نہیں، الجھاؤ نہیں، ابہام نہیں، ان میں سے ایک ایک شق کے متعلق قرآن کی صاف اور کھلی کھلی آیات موجود ہیں اور انھیں ہر وقت پیش کیا جا سکتا ہے۔ محترم پرویز صاحب ان تمام مسائل کو معارف القرآن کی تیسری جلد (باب حضرت عیسیٰ علیہ السلام) اور چوتھی جلد (باب ختم نبوت) میں نہایت واضح طور پر حل کر چکے ہیں۔ بایں ہمہ اگر اس مسئلہ کی ایسی ہی اہمیت سمجھی گئی تو ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ ان مباحث کو از سرِ نو ایک خود مکتفی تصنیف میں مرتب فرما دیں (اگرچہ قرآن کریم کے لغت اور ترجمہ اور سلسلۂ معارف القرآن کے جس عظیم الشان کام میں وہ اس وقت ہمہ تن مصروف ہیں اس کے پیش نظر جی نہیں چاہتا کہ ان کے ذمہ یہ کام بھی ڈال دیا جائے) ممکن ہے اس دوران میں اور لکھنے والے حضرات بھی اس طرف توجہ کریں۔

لیکن [illegible] کی [illegible] کے اعتراف [illegible] عقیدہ کو [illegible] سمجھ لینا چاہیئے کہ ان غلط تصورات کا ازالہ خالی تحریروں سے ناممکن ہے۔ یہ تصورات اس وقت پیدا ہوئے تھے جب [illegible] قرآنی نظام [illegible] ہو چکا تھا۔ لہٰذا یہ اسی [illegible]

جب قرآنی نظام پھر امت کے سامنے آجائے گا۔ قرآن نے دین کا تصور نہایت صاف اور واضح دیا تھا جس میں کسی آنے والے کے تصور کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی۔ دین کے ابدی اور غیر متبدل اصول کتاب اللہ کے اندر محفوظ کر کے دیدیئے گئے اور اس کے ساتھ ہی ایک امت تیار کر دی گئی جو قرآن کو عملی نظام کی شکل میں رائج کرتی رہے۔ اس نظام کی موجودگی میں نہ کسی نبی کی ضرورت باقی رہتی تھی نہ کسی مہدی اور مجدد کی۔ نبی کا کام خدا کی کتاب دے رہی تھی اور مہدی اور مجدد کے فرائض امت کا جیتا جاگتا نظام ادا کر رہا تھا۔ جب یہ نظام بگڑا تو پھر امت لگی خارجی آسرے ڈھونڈنے۔ یہ آسرے آنے والوں کے تصورات کی صورت میں تراشے گئے لہذا جب تک پھر اسی قرآنی نظام کا قیام نہیں ہوتا جو نبی اکرمؐ نے قائم کیا تھا آنے والوں کا انتظار ختم نہیں ہو سکتا۔ ساتھ ہی یہ حقیقت بھی سامنے آجائے گی کہ قرآن کے اندر کس طرح دین کی تکمیل ہو چکی ہے اور اس کی موجودگی میں کس طرح کسی دوسری راہ نما کی ضرورت باقی نہیں رہی اور یہ حقیقت بھی کہ وہ امت جو اس نظام کو چلانے والی ہوگی کس طرح دنیا بھر کے دکھوں کی مسیحائی کریگی اور کس طرح سب سے زیادہ ہدایت یافتہ ثابت ہوگی اور ہر نئے مسئلہ کا حل قرآن کی روشنی میں دریافت کر کے "دین کی تجدید" کرتی چلی جائے گی۔

۲۔ تین وقتوں کی نماز

لاہور سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ

"طلوع اسلام ماہ ستمبر ۱۹۵۳ء کے باب المراسلات میں آپ نے تذکرہ فرمایا ہے کہ راولپنڈی سے کسی صاحب نے آپ کو لکھا ہے کہ وہاں کے کوئی ایک مولوی صاحب لوگوں سے کہتے رہتے ہیں کہ "طلوع اسلام ایک نیا مذہب ایجاد کر رہا ہے اور وہ کہتا ہے کہ نمازیں پانچ وقت کی نہیں بلکہ تین وقت کی پڑھنی چاہئیں۔ اور روزے مہینے بھر کے نہیں بلکہ صرف نو دن کے رکھنے فرض ہیں"۔

افسوس ہے کہ آپ نے اتنے بڑے اہم مضمون کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور مولوی کی بات کو غلط کہہ کر بات ختم کر دی۔ مانا کہ جو مولوی کہہ رہا ہے وہ آپ نے نہ کہا ہوگا۔ مولوی آپ پر بہتان باندھتا ہے، یہ ایسا ہی ہوگا مگر جب ایک بات سامنے آہی گئی ہے تو پھر فرار کیوں؟

بیا تا کارِ ایں امت بسازیم   قمارِ زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجدِ شہر   کہ دل در سینۂ ملّا گدازیم   (اقبال)

ملّا نے کیسے کیسے اور کہاں کہاں تک مسلمانوں کو ذلیل و خوار اور اسلام کو بدشکل و بدنما کر دیا؟ "مسلمان در گور و مسلمانی در کتاب" یہ صورت اسلام کیوں پیدا ہوئی؟ صرف ملّا کی نظرِ عنایت سے۔ آپ اپنے مسلک کو بھول گئے۔ آپ نے اسی اتہام ملّا کا جواب دیتے ہوئے آخر میں ارشاد فرمایا ہے کہ "یاد رکھئے طلوع اسلام نہ کوئی نیا مذہب ایجاد کرنا چاہتا ہے اور نہ ہی کوئی فرقہ بنانا چاہتا ہے البتہ اس کی کوشش یہ ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کو کسی طرح ملّا کے جنگل سے چھڑا دے جس نے انھیں نہ دین کا رہنے دیا اور نہ دنیا کا۔" تو آئیے ہم سب مل کر ملّا کی ان کوششوں کو ناکام بنا دیں۔ تا نباشد چیزکے کس نہ گوید چیزہا۔

اگر آپ نے وہ کچھ نہیں کہا جو ملّا کہتا ہے تو یقین کیجئے کہ کسی نہ کسی نے ضرور ایسا کہا ہے۔ سنئے! یہ بات پاکستان (یا ہندوستان) کے ایک بہت جید عالم علامہ سید سلیمان ندوی نے ارشاد فرمائی ہے۔ وہ اپنی مشہور و معروف تالیف سیرۃ النبی جلد پنجم کے

صفحہ ۱۳۰ پر ارشاد فرماتے ہیں :-

"ایک نکتہ"

جمع بین الصلوٰتین | "اوپر کی آیتوں پر غور کی نظر ڈالنے سے ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے پہلی آیتوں میں ظہر اور عصر کی نمازیں مجمل ہیں یعنی دونوں کو ایک لفظ " قَبْلَ الْغُرُوْبِ " یا " اصیل " یا " طرف النہار " کے ذریعہ سے بیان کیا گیا ہے۔ آخری آیت میں جو سورۂ روم کی ہے ظہر و عصر کی نمازوں کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے۔ مگر شام کی نمازیں اجمال ہے یعنی مغرب و عشا دونوں کو حین تمسون (جب رات کرو) کے ذریعہ سے ادا کر دیا گیا ہے۔ اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں مل کر ایک بھی ہیں اور علیحدہ بھی ہیں۔ اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشا کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے ہیں[۱]۔ اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں ہمیشہ علیحدہ ذکر کی گئی ہے اس لئے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں ہے۔ احادیث میں جمع بین الصلوٰتین کے عنوان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی مثالیں اس نکتہ قرآنی کی تشریح میں موجود ہیں۔"

علامہ ندوی صاحب اوپر کے نشان[۱] کی تشریح نیچے حاشیہ پر حسب ذیل کرتے ہیں :-

"موطا امام مالک ، مسلم ۔ ترمذی ۔ باب القصر فی الصلوۃ فی السفر والحضر میں بعض مستشرقین کو جمع بین الصلوٰتین کی حدیثیں دیکھ کر شبہ ہوا کہ زمانۂ نبوی میں شاید تین وقت کی نمازیں ادا ہوتی تھیں (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں غاضل ونیک کو بھی یہی شبہ ہوا ہے۔ دیکھو اس کا مضمون صلوٰۃ) ، مگر حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ نمازیں ہمیشہ پانچ وقتوں کی ہوتی تھیں۔ البتہ بضرورت ظہر و عصر کو ایک ساتھ اور مغرب و عشا کو ایک ساتھ ملا کر پڑھ لیتے تھے۔ رکعتیں اتنی ہی رہتی تھیں صرف وقت میں کمی ہو جاتی تھی۔ فقہا میں باہم اس کے متعلق اختلاف ہے کہ دو دو نمازوں کو یکجا کن صورتوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ احناف (حنفی صاحبان) کے نزدیک حقیقی طور سے صرف دو موقعوں پر ہے اور دونوں حج میں۔ ایک عرفات میں ۹ ذی الحجہ کو ظہر اور عصر دونوں ظہر کے وقت ادا کی جاتی ہیں کیونکہ اس دن عصر کا وقت خاص حج کی دعاؤں کے لئے ہے اور دوسرے اسی تاریخ کو مزدلفہ میں مغرب اور عشا دونوں عشا کے وقت ایک ساتھ ادا کی جاتی ہیں ، کیونکہ مغرب کا وقت عرفات سے مزدلفہ تک آنے میں عموماً گذر جاتا ہے بقیہ نمازوں میں حنفیہ کے نزدیک حقیقی یکجائی نہیں بلکہ محض صورۃً دو دو نمازیں ایک ساتھ ادا کی جا سکتی ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک نماز آخر وقت میں اور دوسری اول وقت میں پڑھی جائے۔ حنفیہ کے علاوہ دوسرے فقہا کے نزدیک سفر میں حقیقتاً دو نمازیں یکجا ایک وقت میں پڑھی جا سکتی ہیں۔ اور آنحضرت صلعم نے ایسا کیا ہے۔ شیعوں میں ظہر و عصر ایک ساتھ اور مغرب و عشا ایک ساتھ پڑھنے کا عام رواج ہے۔"

نتیجہ | علامہ ندوی نے جو کچھ ارشاد فرمایا اس کا نتیجہ یہ ثابت ہوا کہ مسلمانوں کا ہر فرقہ و مذہب " جمع بین الصلوٰتین " کا قائل اور عامل رہا ہے اور ہو سکتا ہے۔ اس طرح کہ نماز ظہر اپنے وقت کے اخیر پر نماز عصر کے شروع ہونے سے اتنا عرصہ پہلے شروع کی جائے کہ اس کے

ختم ہوتے ہی نماز عصر شروع کردی جائے۔ نماز مغرب کا وقت ہی اتنا کم ہے کہ اس کے ختم ہوتے ہی نماز عشا کا وقت شروع ہو جاتا ہے چنانچہ یہ چاروں نمازیں اپنے اپنے صحیح وقت کے اندر پڑھنے پر بھی بجائے چار کے صرف دو ہی وقت خرچ ہوتے ہیں اور نماز صبح الگ اپنے وقت پر۔ چنانچہ درحقیقت تین اوقات میں ہی پانچوں نمازیں ادا ہو جاتی ہیں۔ اس آسانی پر بقول علامہ ندوی صاحب خود تمام آیاتِ قرآن ہی مہر تصدیق ثبت کردیتی ہیں پھر بھی تصدیق مزید ترمذی کی حدیث جمع بین الصلوٰتین کرتی ہے جو حسب ذیل ہے اور جس کی طرف علامہ ندوی نے اوپر اشارہ بھی کیا ہے۔ "حدیث از حضرت ابن عباسؓ۔ فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں بلا کسی خوف یا بارش کے ظہر اور عصر کو اور مغرب اور عشا کو جمع کیا۔ ابن عباسؓ سے کہا گیا کہ آنحضرتؐ کا اس سے کیا ارادہ تھا؟ اس نے کہا یہ کہ آپ کی امت تنگی میں نہ پڑے"۔ یعنی یہ تکمیل حکم خداوندی لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا (اللہ کسی شخص کو اس کی قوت برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا)۔

امید ہے کہ اڈیٹر صاحب طلوع اسلام میری اس صدائے نحیف کو راولپنڈی کے مولوی صاحب اور اپنے تمام قارئین کرام تک بذریعہ طلوع اسلام پہنچا کر مجھے ممنونِ احسان فرمائیں گے۔

طلوع اسلام کچھ عرصہ پہلے طلوع اسلام میں ایک اصولی بحث چھیڑی گئی تھی کہ قرآن کریم کی نصوصِ صریحہ سے کتنے وقت کی نمازیں ثابت ہوتی ہیں۔ یہ بحث تو چلی لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ حقیقت سامنے آگئی کہ ابھی ہم لوگ (شعوری یا غیر شعوری طور پر) اپنی اپنی گروہ بندانہ عقیدتمندیوں سے آگے بڑھ کر خالص قرآن کی روشنی میں ان مسائل پر گفتگو کرنے یا جس نتیجہ پر قرآن پہنچائے اسے تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ اس بنا پر اس بحث کو تشنۂ تکمیل چھوڑ کر ختم کردیا گیا۔ اسے اس وقت از سر نو چھیڑنے کا بھی ارادہ نہیں۔ اسلئے ہم نہ تو اوقات صلوٰۃ اور نہ ہی جمع بین الصلوٰتین کی روایات کے متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مسلک یہ ہے کہ جن امور میں قرآن کریم نے جزئیات کی تصریح خود کردی ہے ان میں ساری امت کو مل کر بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ ذرا سا رد و بدل کرسکے۔ لیکن جن جزئیات کو قرآن نے غیر متعین چھوڑ دیا ہے ان کا تعین ملت کا وہ نظام کرسکتا ہے جو قرآن کو عملاً نافذ کرنے کے لئے متشکل ہو۔ اسوقت جبکہ وہ نظام موجود نہیں، کسی فرد کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان جزئیات کو متعین کرے یا ان کی بابت کوئی "فتویٰ" دے۔ طلوع اسلام کی دعوت یہ ہے کہ یہاں قرآنی نظام کو قائم کیا جائے۔ ان مسائل کا فیصلہ وہی نظام کریگا۔ طلوع اسلام اس بارے میں حکم بن کر ملت میں انتشار کا موجب نہیں بننا چاہتا۔ البتہ اسوقت وہ یہ ضرور بتاتا ہے کہ ہمارے موجودہ تصورات و معتقدات میں سے کون کون سے غیر قرآنی ہیں۔

حلقۂ معاونینِ طلوعِ اسلام

طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جولائی، اگست، ستمبر اور اکتوبر ۱۹۵۳ء میں ان ایک سو چونتیس (۱۳۴) حضرات کے نام شائع ہو چکے ہیں جنہوں نے ہماری دعوت پر لبیک کہا اور معاونین کے حلقہ میں شامل ہو گئے۔ اس کے بعد جو دیگر احباب حلقۂ معاونین میں (۲۱ اکتوبر تک) شامل ہوئے ہیں ان کے اسمائے گرامی شکریہ کے ساتھ درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ معاونین کی کل تعداد اس وقت تک ایک سو اڑتالیس ہوئی ہے جو حضرات ابھی تک اس حلقہ میں شامل نہیں ہوئے وہ خود غور فرمائیں کہ قرآنی فکر اور نظام کی اشاعت کی اتنی بڑی سکیم اس قلیل سی رقم کے ساتھ کس حد تک آگے بڑھ سکے گی۔ اسکیم یہ ہے کہ آپ ایک سو روپیہ کی رقم (یکمشت یا چار مساوی اقساط میں) ارسال فرمادیں۔ آپ کو رسالہ طلوعِ اسلام اور ادارہ کی طرف سے شائع ہونے والی تمام کتابیں اس وقت تک بلا قیمت پیش کی جاتی رہیں گی جبتک آپ کی سو روپے کی رقم پوری نہ ہو جائے۔ اگر خدانخواستہ یہ سلسلہ بند کر دینا پڑا تو آپ کی بقایا رقم واپس کر دی جائے گی۔ ہمیں کم از کم ایک ہزار معاونین کی ضرورت ہے۔ توقف نہ کیجئے۔ آپ کو کسی قسم کا بھی خسارہ نہیں رہے گا اور آپ کی مدد سے قرآنی فکر اور نظام کی اشاعت کا انتظام ہو جائے گا۔

فہرست معاونین خصوصی ادارہ طلوعِ اسلام

لاہور	(۱۳۵) ڈاکٹر محمد حیات ملک صاحب۔ میو ہسپتال۔ لاہور
کراچی	(۱۳۶) ایک صاحب جو اپنا نام شائع کرانا نہیں چاہتے۔
	(۱۳۷) ابوالبرکات لاری صاحب۔ کاغذی بازار۔ کراچی
	(۱۳۸) عبدالشکور صاحب۔ کسٹم ہاؤس۔ کراچی
پشاور	(۱۳۹) خان صفی اللہ صاحب۔ ہمانہ ماڑی۔ پشاور
	(۱۴۰) خواجہ محمد حسین صاحب چیف گڈس کلرک۔ پشاور شہر
مردان	(۱۴۱) نور خدیں خانصاحب سکریٹری مسلم لیگ۔ ضلع مردان
	(۱۴۲) محمد امین خانصاحب تخت بھائی پارٹی۔ ضلع مردان
حیدرآباد دکن	(۱۴۳) ہاشم علی صاحب سابق جج ہائی کورٹ ساکن جوبلی ہلز حیدرآباد۔ دکن
راولپنڈی	(۱۴۴) ظہور احمد صاحب محلہ فیروز پورہ مری روڈ۔ راولپنڈی
گجرات	(۱۴۵) حاجی شیخ محمد حسین صاحب جرمنی۔ محلہ خواجگان گجرات
کوئٹہ	(۱۴۶) محمد اقبال صاحب قزلباش جنرل اسٹور۔ اینڈرسن روڈ۔ کوئٹہ۔
منٹگمری	(۱۴۷) عبدالرحمٰن خانصاحب گارڈ ریلوے اسٹیشن پاک پٹن۔ ضلع منٹگمری
ملتان	(۱۴۸) غلام نبی صاحب گڈس کلرک۔ میلسی۔ ضلع ملتان۔

نوٹ: بعض حضرات نے پانچ پانچ یا دس دس روپئے کی رقوم بھیجی ہیں جن کے نام شائع نہیں کئے جا رہے ہیں۔ بہتر ہو کہ ایسے حضرات ہمیں ایک قسط میں پچیس روپے سے کم ارسال نہ فرمائیں کہ اس طرح ایسے حضرات کا علیحدہ حساب رکھنا ادارہ کے لئے سخت دشوار ہے۔

حقائق وعبر

۱۔ ہندوستان میں؟

مجلہ معارف، اعظم گڈھ (بھارت) اپنی ستمبر ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں رقمطراز ہے:۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد سے اس کو اخلاق و تہذیب اور انسانیت و شرافت سے بھی آزادی مل گئی ہے۔ خصوصاً مسلمانوں کے معاملہ میں کسی کے زبان و قلم پر کوئی احتساب نہیں رہ گیا ہے جس کی زبان میں جو آتا ہے کہہ گزرتا ہے، اسوقت ہندوستان کے مسلمان جن مشکلات میں مبتلا ہیں اور امتحان و آزمائش کے جن حالات سے گذر رہے ہیں وہی کیا کم ہیں کہ فرقہ پرستوں نے ان کی دل آزاری کیلئے ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کی تحقیر و تذلیل شروع کر دی ہے، اور ادھر عرصہ سے کتابوں، مضامین اور تقریروں میں علانیہ ان کے خلاف زہر اگلا جا رہا ہے مگر اس کی کوئی باز پرس نہیں کی جاتی۔ اگر کسی مسلمان کے زبان و قلم سے اس کا عشر عشیر بھی ہندو مذہب کے خلاف نکل جاتا، تو اس پر قیامت آجاتی مگر حکومت اس فتنہ انگیزی کی جانب کوئی توجہ نہیں کرتی۔

اسلام پر اس قسم کا حملہ شیشہ کے گھر میں بیٹھکر قلعہ پر پتھر پھینکنے کے مرادف ہے۔ مسلمان اس کا پورا جواب دے سکتے ہیں مگر حکومت کے مقابلہ میں مجبور و بے بس ہیں۔ اگر کسی مسلمان کے قلم سے ایک لفظ بھی ہندو مذہب کے خلاف نکل جاتا ہے تو فوراً حکومت کی مشینری حرکت میں آجاتی ہے۔ یہ سیکلرازم کی بالکل نئی قسم ہے۔ آخر حکومت کب تک مسلمانوں کی توہین و تحقیر کا تماشہ دیکھتی اور ان کے ضبط و تحمل کا امتحان لیتی رہیگی، اس کو کچھ تو اپنی سیکلرازم کی لاج رکھنا چاہئے۔ کسی فرقہ کے مذہب کو برا بھلا کہنا قانون اور تہذیب و شرافت سب کے خلاف ہے مگر افسوس ہے کہ ہندوستان اس سبق کو بھولتا جا رہا ہے۔ کم از کم اس معاملہ میں اس کو پاکستان سے سبق حاصل کرنا چاہئے، جہاں سے ایک آواز بھی ہندو مذہب کے خلاف سننے میں نہیں آتی۔

ہم پوچھنا چاہتے ہیں ان لوگوں سے جو پاکستان کے نظم و نسق کی خرابیوں کو دیکھکر خود پاکستان کو کوسنے لگ جاتے ہیں اور نہایت بے باکی سے کہدیتے ہیں کہ اس سے تو بہتر تھا کہ پاکستان نہ ہی بنتا، کہ کیا ان کے نزدیک وہ زندگی (جس کا ذکر معارف نے کیا ہے) بڑی خوشگوار اور قابل رشک ہے کہ انھیں پاکستان کا بننا ایسا ناگوار گذر رہا ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ پاکستان میں نظم و نسق کی خرابیاں ایسی شدت اختیار کر گئی ہیں کہ ان سے متاثر ہو کر ہر قلب حساس طلسم پیچ و تاب بن جانے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن اسکے باوجود، یہ خطہ زمین ہندوستان سے لاکھ درجہ بہتر ہے جس میں اگر ہم چاہیں تو اپنے تصورات کے مطابق اپنی زندگی ڈھال سکتے ہیں

یہاں جس قدر خرابیاں ہیں ہماری اپنی پیدا کردہ ہیں۔ اس سرزمین کی پیدا کردہ نہیں۔ لیکن ہندوستان کا مظلوم مسلمان جن مصیبتوں کا شکار ہو رہا ہے وہ اس کی اپنی پیدا کردہ نہیں۔ وہ اس سرزمین کی پیدا کردہ ہیں جس میں وہ رہتا ہے۔ یہ ہے فرق یہاں اور وہاں کی زندگی میں!

لیکن ہم اس کے ساتھ ایک بات اپنے ارباب حل و عقد سے بھی پوچھنا چاہتے ہیں جب حصول پاکستان کے لئے جدوجہد ہو رہی تھی تو یہ سوال اکثر سامنے آتا تھا کہ ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کا کیا بنے گا؟ اس کے جواب میں ہمیشہ یہ کہا جاتا تھا کہ ایک تو ہمارے ہاں خود غیر مسلم اقلیتیں اتنی ہوں گی جو ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے بطور یرغمال کام دینگی۔ دوسرے ہمارے پاس اتنی قوت ہوگی جس کی بنا پر ہم ہندوستان کے مسلمانوں کے حقوق کا کماحقہ تحفظ کر سکیں گے۔ وہ غیر مسلم اقلیتیں تو ہمارے پاس (مغربی پاکستان میں) نہ رہیں (اور اگر رہتیں بھی تو یہ اصول ہی غلط تھا کہ ہم ہندوستان کے مسلمانوں کا بدلہ ان سے لیتے)۔ اب صرف یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ وہ قوت کہاں ہے جس کے بھروسے پر ہم ہندوستان کے مسلمانوں کا تحفظ کرنا چاہتے تھے؟ وہ قوت پیدا ہو سکتی تھی ملت کی وحدت اور افراد ملت کے کیریکٹر سے۔ لیکن یہاں وحدت اور سیرت دونوں جس بری طرح سے ذبح ہو رہی ہیں اس پر ہر چشم عبرت خونابہ فشاں ہے۔

ہم اس حقیقت کو پھر دہرا دینا چاہتے ہیں جسے ہم شروع سے پیش کرتے چلے آرہے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مسئلہ کا حل اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ دونوں حکومتوں کی رضامندی سے ان کا تبادلہ یہاں کی غیر مسلم آبادی سے کر لیا جائے اور جس قدر زائد نفوس ہماری طرف آئیں ان کے لئے زائد خطۂ زمین حاصل کر لیا جائے۔

لیکن ہم، جو اسوقت تک آئے ہوئے "مہاجرین" کے لئے جھونپڑوں تک کا انتظام نہیں کر سکے، اور چار کروڑ کی آبادی کا انتظام کیا کریں گے؟ یہ تمام انتظامات قرآن کے اس نظام ربوبیت کی رو سے ممکن تھے جس میں دولت کے سرچشمے افراد کی ملکیت سے نکل کر، ملت کے اجتماعی مصرف کے لئے وقف ہو جاتے ہیں لیکن یہاں قرآن کی بات سننے کے لئے کون آمادہ ہے!

اُف! کسقدر عبرت انگیز ہے یہ منظر کہ ہماری آنکھوں کے سامنے چار کروڑ مسلمان اس کرب والم کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس کے بعد نظر آتا ہے کہ ان بیچاروں کا وہی حشر ہونیوالا ہے جو اسپین کے مسلمانوں کا ہوا تھا اور ہم کچھ نہیں کر سکتے؟

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں!

۲۔ کشمیر کا مسئلہ

وہ جو کہتے ہیں کہ

خدا خود میر سامان است ارباب توکل را

تو یہ محض "شاعری" نہیں، حقیقت ہے۔ اور اس کا ثبوت ہمارے ہاں قدم قدم پر مل سکتا ہے۔ مثلاً دو ماہ پیشتر جب سرینگر میں شیخ عبداللہ کی برطرفی اور گرفتاری کا حادثہ پیش آیا تو پاکستان کے ارباب بست و کشاد مسئلہ کشمیر کے حل کے لئے تڑپ کر اٹھ کھڑے

ہوئے جلسے۔ تقریریں۔ ریزولیشنز۔ بیانات ـــ "باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم" کے فلک بوس نعرے۔ محترم وزیر اعظم پاکستان کا سفرِ ہندوستان۔ ہماری کابینہ کے اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کے اجلاس! ایسا نظر آتا تھا کہ اب یہ لوگ اس وقت تک دم نہیں لیں گے جب تک کشمیر پاکستان کا حصہ نہیں بن جاتا۔

لیکن "اربابِ توکل کے میر ساماں" نے پاکستان کی کانسٹی ٹیوشن کا مسئلہ آگے بڑھا دیا اور ساری قوم نشستوں کی گنتی میں لگ گئی۔ اب کشمیر اور اس کا مسئلہ کسی کے خواب تک میں بھی نہیں آتا۔ واقعی "اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے"۔ وہ اپنے بندوں کو کس خوبصورتی سے مشکلات کے بھنور سے نکال کر باہر لے آتا ہے؟ غور کرو کہ تشکیلِ پاکستان سے لیکر اب تک کیسے کیسے اہم اور مشکل مسائل سامنے آئے اور وہ کس طرح ایک ایک کر کے، مسئلہ کشمیر کی طرح خود بخود حل ہوتے چلے گئے۔ بتاؤ کہ "تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟"

۳۔ مولوی کی کہانی خود مولوی کی زبانی

پہلے کہانی سنئے، جو مجلہ معارف (اعظم گڑھ) کی ستمبر کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ وہو ھذا۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم مولویوں، جن کا خطاب میر باقر داماد کی "الافق المبین" کے الفاظ میں "لم لا یکونیون" اور "لا نسلمیون" بھی ہے یعنی لم لا یکون کذا (ایسا کیوں نہیں ہو سکتا) اور لا نسلم (ہم یہ تسلیم نہیں کرتے) یہ دو حربے ہمارے ہاتھوں میں ایسے ہیں کہ جب تک جس مسئلہ کے متعلق جو جی میں آئے ہم کہتے چلے جا سکتے ہیں، خدا نہ کرے کہ ہم مدرسہ والوں کے درمیان کسی بد قسمت آدمی کی کوئی بات جا پڑے۔ جنگلوں کے درخت اور گھاس جن سے کاغذ تیار کئے جاتے ہیں، شاید کانپ اٹھتے ہوں، جب ان کو خبر ملتی ہو کہ مولویوں نے "آستینیں" لم لا یکون کذا" اور لا نسلم کہنے کیلئے چڑھائی ہیں۔ سمندر بھی تھرا اٹھیں کہ ان کا پانی بھی ہم مولویوں کے لم لا یکونیات اور لا نسلمیات کی سیاہی کیلئے کافی نہیں ہو سکتا۔

یہ مسئلہ کہ مزارعت (یعنی ترینڈی خواہ بٹائی پر ہو یا نقدی پر) ائمہ سلف میں کچھ لوگ اس معاملہ کے عدم جواز کے قائل تھے یا مسلمانوں کی تاریخ و فلسفہ کی کتابوں میں علوم الدوائل کا جس حصہ میں ذکر کیا جاتا ہے اس میں "بوذاسف" کا لفظ عام طور جہاں کہیں استعمال ہوا ہے مراد اس سے "گوتم بدھ" ہے۔ یہ تو خیر غیر معروف مسائل ہیں، نماز میں آمین زور سے کہنا بہتر ہے یا آہستہ، رفع الیدین، امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کا پڑھنا، روزمرہ کے اسلامی عبادات کے اجزا ہیں۔ لیکن ان عام مسائل کے متعلق بھی جب کہ دنیا جانتی ہے لم لا یکون اور لا نسلم کے قصے آج تک ختم نہیں ہوئے ہیں، ہزارہا صفحات فریقین کی طرف سے لکھے جا چکے ہیں اور ہنوز روز اول ہے۔

اب یہ سنئے کہ یہ کس کی زبانی ہے؟ یہ ہے مولانا مناظر احسن گیلانی صاحب کی زبانی، جو ہمارے زمانے کے بہت بڑے مولوی ہیں۔

باقی رہی کہاں کی صداقت۔ سو اس کی شہادت آپ کو ہر مسجد، ہر مکتب، ہر منبر اور حجرہ سے مل سکے گی!

بوٹا بوٹا۔ پتہ پتہ۔ حال ہمارا جانے ہے

خدا نے "عباد الرحمٰن" کے متعلق کہا تھا کہ اذا مروا باللغو مروا کراما (۲۵/۷۲) کہ اگر کبھی ایسا ہو جائے کہ انھیں کسی ایسے مقام سے گذرنا پڑے جہاں بے نتیجہ (لغو[1]) باتیں ہو رہی ہوں تو وہ نہایت آبرو مندانہ انداز سے دامن بچاتے ہوئے گذر جاتے ہیں۔ لیکن ایک یہ (مولویوں کی) قوم ہے جو خود اپنی زبان سے اقرار کر رہی ہے کہ وہ ہزار برس سے بے معنی باتوں میں الجھے چلے آرہے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ اللہ کے عرش عظیم کو ہمیں تھامے ہوئے ہیں۔ خدا ایں سخت جاں را یار بادا!

۴۔ تنکوں کے پل

دور حاضر کے تقاضوں نے جس مصیبت میں ہمارے مولوی صاحبان کو گرفتار کر رکھا ہے اس کا اندازہ بہت کم لگایا جاتا ہے۔ عصر حاضر کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ہر دعوے کیلئے دلیل مانگتا ہے۔ مولوی صاحبان بچارے اس انداز گفتگو کے کبھی عادی ہی نہ تھے۔ انھیں ساری عمر یہ پڑھایا جاتا رہا کہ یہ بات اس لئے صحیح ہے کہ علامہ تفتازانی نے ایسا کہا ہے۔ اور اسی "دلیل" کے زور پر وہ جہلاء سے اپنی باتیں منواتے رہے۔ لیکن اب ان سے کہا جاتا ہے کہ خود علامہ تفتازانی کے پاس اس کی کیا دلیل تھی! تو یہ بچارے بری طرح سے زچ آتے ہیں۔ ان کی یہی مشکل ہے جس کی وجہ سے ان کی حالت یہ ہو رہی ہے کہ اگر انھیں اپنے کسی دعوے کی تائید میں کوئی کمزور سے کمزور دلیل بھی مل جاتی ہے تو اس کا ڈھول پیٹنے لگ جاتے ہیں اور اس جوش مسرت میں انھیں اتنا بھی یاد نہیں رہتا کہ یہ تو دیکھ لیا جائے کہ جن تنکوں سے یہ اتنا بڑا پل بنا رہے ہیں ان میں اتنی سکت ہے کہ ان پر سے ہاتھی گذر جائیں؟ ان تنکوں کے پل کی ایک تازہ مثال ملاحظہ فرمائیے۔ صدق جدید کے مدیر، دریاباد کے مشہور مولوی عبدالماجد صاحب، ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:-

> صحیفہ ہمام ابن منبہ (عربی) مرتب ڈاکٹر محمد حمید اللہ ۶۲ صفحہ۔ قیمت درج نہیں۔ پتا: حبیب اینڈ کو۔ اسٹیشن روڈ۔ کٹل منڈی۔ حیدر آباد دکن۔
>
> حجیت حدیث کے منکرین کی طرف سے شد و مد سے کہا جاتا ہے کہ حدیثوں کا اعتبار ہی کیا۔ وفات رسول کے ڈھائی تین سو سال بعد تو کہیں ان کی کتابت شروع ہوئی ہے۔ اس بے اصل الزام کا جواب اگرچہ بار بار دیا جا چکا ہے اور بتایا جا چکا ہے کہ حدیثوں کے مجموعے تیسری صدی میں نہیں بلکہ اس سے بہت قبل دوسری ہی صدی میں وجود میں آنے لگے تھے۔ تاہم ابتک کوئی ایسا مجموعہ احادیث دنیا کے سامنے نہ تھا جو پہلی ہی صدی میں مرتب ہو چکا ہو۔ حیدر آباد دکن کے ڈاکٹر محمد حمید اللہ جو پولیس ایکشن کے بعد سے مہجور وطن ہو کر اب پاکستانی ہی نہیں بلکہ فرانسادی ہیں۔ علم و دین کی بیش بہا خدمات میں مسلسل مصروف ہیں۔ اور اب اللہ نے انھیں اس بے نظیر سعادت سے نوازا ہے کہ انھوں نے ہمام بن منبہ یمانی تابعی (متوفی ۱۳۱ھ) کا جمع کیا ہوا

---

[1] لغو کے معنی ہیں جانوروں کی بولی۔ چڑیوں کا چہچہانا۔ بے معنی باتیں۔

"صحیفہ" احادیث کے دو قلمی نسخے برلن اور دمشق سے ڈھونڈھ نکالے ہیں اور مقابلہ و تصحیح کے بعد اسے دمشق میں چھپوا کر شائع بھی کر دیا ہے۔ ذالک فضل اللہ الخ

یہ ہمام تابعی شاگرد رشید ابوہریرہؓ یمانی صحابی کے تھے جن کا سال وفات ۵۸ھ ہے اور ہمام نے یہ احادیث ان کی زندگی ہی میں ان سے سن کر مدون کرلی تھیں اسلئے مقرر اس کا زمانہ تالیف ۵۸ھ سے قبل ہی یعنی پہلی صدی ہجری کے وسط کا ہے۔ اتنی قدیم کتاب حدیث کی آجتک نہیں شائع ہوئی تھی (اگر فرامین و مکاتیب نبویؐ وغیرہ کو مستثنیٰ کر دیا جائے)۔ اور اللہ نے یہ سعادت بڑے بڑے عالموں فاضلوں کے موجود ہوتے ہوئے ایک انگریزی خواں ڈاکٹر کے حصہ میں ڈالدی!

ایں سعادت بزور بازو نیست

کتاب کا اصل نام الصحیفۃ الصحیحہ تھا، جس طرح عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے مجموعہ کا نام الصحیفۃ الصادقہ تھا) احادیث تعداد میں کل ۱۳۸ ہیں عموماً مختصر ہی ہیں اور جیسا کہ مرتب نے اپنے مقدمہ میں لکھدیا ہے سب کی سب ایسی ہیں جو مسند احمد بن حنبل اور صحیح بخاری وغیرہ میں آچکی ہیں۔ اصل کتاب کل ۲۲ صفحے میں ۲۷ سے ۴۸ تک آگئی ہے۔

(صدق جدید لکھنؤ۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۵۳ء)

آپ نے غور فرمایا ہے کہ ان مولوی صاحب کو وہ کونسا ایٹم بم مل گیا ہے جس کے زور پر انھوں نے سمجھ لیا ہے کہ منکرین حدیث کے تمام قلعے مسمار ہو گئے ہیں؟ انھیں حدیث کی ایک کتاب مل گئی ہے جو پہلی صدی ہجری کی تدوین ہے اور جس میں ایک دو نہیں اکٹھی ایک سو اڑتیس احادیث ہیں اور وہ کتاب کے دو چار صفحات میں نہیں آگئیں پورے بائیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں؟ فرمائیے! اس کے بعد منکرین حدیث کی کوئی دلیل باقی رہ جاتی ہے جس کا جواب نہ مل جاتا ہو!

معلوم نہیں اسے ابلہ فریبی کہا جائے یا خود فریبی جو یہ لوگ اس قسم کی بچوں کی سی باتیں کرتے رہتے ہیں اور اتنا بھی نہیں سوچ سکتے کہ جو بات اس شد و مد سے پیش کی جارہی ہے وہ خود اپنے ہی خلاف تو نہیں جاتی؟ ذرا غور کیجئے کہ ایک شخص پہلی صدی ہجری میں، بلکہ ۵۸ھ سے پہلے، مدینہ میں بیٹھکر حضرت ابوہریرہؓ کی شاگردی میں، احادیث کا مجموعہ مرتب کرتا ہے اور اُسے کل ۱۳۸ احادیث ملتی ہیں۔ (یاد رہے کہ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ رسول اللہؐ کی وفات کو ابھی قریب چالیس برس ہوئے ہیں مدینہ میں بیشتر صحابی موجود ہیں۔ ان میں سے احادیث کے بہت بڑے راوی حضرت ابوہریرہؓ کے زیر تلمذ مجموعۂ احادیث مرتب ہوتا ہے اور اس میں کل ایک سو اڑتیس حدیثیں درج ہوتی ہیں) ۔ اس کے دو سو سال بعد ایک صاحب بخارا سے آتے ہیں اور انھیں چھ لاکھ حدیثیں مل جاتی ہیں۔ جن میں سے وہ قریب سات ہزار کو اپنے مجموعہ میں داخل کر لیتے ہیں (ان کے اساتذہ میں سے امام احمد بن حنبلؒ دس لاکھ اور امام یحییٰ ابن معینؒ بارہ لاکھ حدیثوں کے مالک تھے) ۔ حدیث کی صرف ایک کتاب مسند امام احمد بن حنبلؒ ہی کو اگر لیا جاوے تو صرف وہ حدیثیں جو حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہیں بڑے سائز کے باریک مصری ٹائپ میں تین سو تیرہ صفحات تک پھیلی ہوئی ہیں۔ آپ ان حقائق کو کسی ایسے شخص کے سامنے رکھئے جو گروہ بندانہ عقیدت مندی سے بلند ہو کر

ان پر غور کرے اور پھر اس سے پوچھئے کہ وہ کس نتیجے پر پہنچتا ہے؟ کیا وہ اس نتیجے پر نہیں پہنچے گا کہ جب ۵۸ھ میں ایک شخص کو مدینے میں حضرت ابوہریرہؓ کے زیر تلمذ بیٹھکر صرف ۱۳۸۰ احادیث مل سکیں اور دو سو سال بعد ان احادیث کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی تو اس سے ظاہر ہے کہ اس تمام عرصے میں لوگوں نے حدیثوں کو وضع کیا اور خوب پھیلایا۔

یہ ہے اس ایٹم بم کی حقیقت جسے حضرت مولانا عبدالماجد صاحب منکرین حدیث کے قلعوں کو منہدم کرنے کے لئے بڑی دور سے تلاش کر کے لائے ہیں۔

ہمیں منکرین حدیث کی بابت تو معلوم نہیں کہ وہ کون لوگ ہیں اور ان کا کہنا کیا ہے۔ البتہ طلوع اسلام اس باب میں جو کچھ کہتا ہے وہ فقط یہ ہے کہ اگر احادیث دین کا جزو لاینفک تھیں اور ان کے بغیر نہ قرآن سمجھا جا سکتا تھا اور نہ ہی دین کی تکمیل ہو سکتی تھی، تو کیا یہ چیز رسول اللہؐ کے فریضۂ رسالت میں داخل نہ تھی کہ آپ دین کے اس حصے کو خود مدون و مرتب کر کے اسی طرح امت کو دے جاتے جس طرح آپ نے دین کے دوسرے حصے (یعنی قرآن) کو دیا تھا؟ یا تو آپ یہ بتائیے کہ فلاں مجموعۂ احادیث وہ ہے جسے رسول اللہؐ نے مرتب کر کے مصدقہ طور پر امت کو دیا تھا۔ اور اگر آپ یہ نہیں بتا سکتے (اور آپ قیامت تک نہیں بتا سکتے کیونکہ رسول اللہؐ نے کوئی مجموعۂ احادیث مرتب کر کے امت کو نہیں دیا تھا۔ آپ نے صرف قرآن امت کو دیا تھا) تو پھر آپ کے اس دعوے کی روشنی میں کہ احادیث دین کا جزو ہیں اور ان کے بغیر دین نامکمل رہ جاتا ہے اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) رسول اللہؐ نے اپنے فریضۂ رسالت کو ادھورا چھوڑ دیا اور اسے بعد میں مختلف لوگوں نے اپنی اپنی انفرادی کوششوں سے پورا کیا!

یہ ہے وہ سوال جسے طلوع اسلام برسوں سے اپنے صفحات پر دہرا رہا ہے لیکن اس کا جواب آج تک کسی نے نہیں دیا۔ (ایک صاحب — مولانا محمد یوسف کلکتوی صاحب) نے اس کا جواب دیا ہی دیا تو یہ کہا کہ رسول اللہؐ قرآن کو بھی اسی طرح نامرتب شکل میں چھوڑ گئے تھے اور امت نے بعد میں اسے مرتب کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ، اپنے رسولؐ کو ایسے امتیوں کی "عقیدت" سے محفوظ رکھے!)۔ ہم جناب عبدالماجد اور ان کے دیگر ہمنوا مولوی صاحبان سے گذارش کریں گے کہ اگر ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب ہے تو وہ اسے پیش کریں تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ احادیث کو دین کا جزو قرار دینے کیلئے ان کے پاس کیا دلیل ہے اور اگر اس سوال کا جواب نہیں دیا جا سکتا تو پھر ۵۸ھ چھوڑ، ۵۸ء کا کوئی مجموعۂ احادیث، حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد نہیں بلکہ خود حضرت ابوہریرہؓ کا بھی مل جائے تو بھی وہ دین نہیں بن سکتا۔ دین وہی ہے جسے اللہ نے اپنے رسولؐ کو دیا اور رسول نے اسے امت کو دیا۔ اور یہ خصوصیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔

۵۔ رسول اللہؐ حنفی تھے یا شافعی؟

مولوی صاحبان کی طرف سے کہا یہ جاتا ہے کہ دین "کتاب اور سنت" کے مجموعہ کا نام ہے اور سنت سے مراد ہیں رسول اللہؐ کے وہ اقوال و اعمال جو احادیث کے مروجہ مجموعوں میں منقول ہیں (جنہیں نہ رسول اللہؐ نے امت کو دیا اور نہ ہی صحابہؓ نے مرتب فرمایا۔ یہ مجموعے

کن رجحانات کے ماتحت مرتب کئے گئے تھے (اور کئے جاتے ہیں) اس کا اندازہ اس تبصرہ سے لگائیے جو احادیث کے ایک تازہ مجموعہ "زجاجۃ المصابیح" پر صدق (لکھنؤ) کی ۹ / اکتوبر ۱۹۵۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس میں لکھا ہے

> خطیب تبریزیؒ کی مشکوٰۃ المصابیح سے دینداروں میں ہر پڑھا لکھا واقف ہے۔ حدیث نبوی کا یہ مستند کارآمد اور نسبتہً مختصر ہونے کے باوجود بڑی حد تک جامع مجموعہ صدیوں سے ہندوستان میں چلا ہوا ہے اور عوام و خواص سب کے حق میں شمع ہدایت کا کام دے رہا ہے لیکن صاحب مشکوٰۃ باوجود اپنی جلالت القدر کے بہر حال حنفی المذہب نہ تھے۔ شافعی تھے۔ اسلئے شافعی مذہب کی رعایت کا ان کی کتاب میں جا بجا آجانا بالکل قدرتی تھا اور اس لئے علماء حنفیہ ایک اسی قسم کے دوسرے مجموعہ احادیث کی ضرورت محسوس کر رہے تھے جس میں رعایت ان کے مسلک و مشرب کی ہو۔ صدیوں کے بعد اس ضرورت کے عملاً پورا کرنے کی سعادت اس حیدرآبادی فاضل کے حصہ میں آئی ہے۔

یعنی مشکوٰۃ المصابیح اس مقصد کے ماتحت مرتب کی گئی تھی کہ یہ ثابت ہو جائے کہ امام شافعیؒ کا مسلک عین مطابق سنت ہے یہ بات حنفاء کو بہت کھلتی تھی۔ اب یہ نیا مجموعہ یہ ثابت کرنے کے لئے مرتب کیا گیا ہے کہ حنفی مذہب سنت رسول اللہ کے مطابق ہے۔ بالفاظ دیگر، مشکوٰۃ المصابیح یہ ثابت کرنے کیلئے مدون کی گئی تھی کہ رسول اللہ شافعی المذہب تھے اور اب زجاجۃ المصابیح یہ ثابت کرنے کے لئے مرتب کی گئی ہے کہ حضورؐ حنفی المسلک تھے۔ اس سے ہمیں ایک دلچسپ لطیفہ یاد آگیا۔ ایک مقلد سے کسی نے کہا کہ امام ابو حنیفہؒ رسول اللہؐ کی وفات کے بہت عرصہ بعد پیدا ہوئے تھے تو وہ سٹ پٹا سا گیا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور بے ساختہ پکار اٹھا کہ تو نے کیا کہا؟ کیا رسول اللہ غیر مقلد ہی فوت ہو گئے؟ اس لطیفہ پر ہنسئے نہیں۔ خون کے آنسو روئیے۔ ہمارے روایات کے مجموعوں کو دین قرار دیا جاتا ہے اور ان مجموعوں کی کیفیت یہ ہے کہ سنیوں کے مجموعے یہ ثابت کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ سنی تھے اور شیعوں کے یہ ثابت کرتے ہیں کہ حضورؐ شیعہ تھے۔ پھر شیعوں میں ایک مجموعہ یہ ثابت کرنے کے لئے مرتب کیا گیا تھا کہ رسول اللہ شافعی المسلک تھے اور دوسرا یہ ثابت کرنے کیلئے مرتب کیا گیا ہے کہ آپ حنفی المذہب تھے! انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یاد رکھئے! جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہا ہے کہ آپ نہ یہودی تھے نہ نصرانی۔ اسی طرح رسول اللہ نہ شیعہ تھے نہ سنی۔ نہ مقلد تھے نہ غیر مقلد۔ نہ شافعی تھے نہ حنفی۔ حضورؐ صرف مسلمان تھے اور آپؐ کا مسلک قرآن کا مسلک تھا۔ باقی سب نسبتیں انسانوں کی پیدا کردہ ہیں اور خدا اور اس کا رسول ان سے بری الذمہ ہیں۔ ھو سمکم المسلمین، خدا کا ارشاد ہے اور انا اول المسلمین، رسول اللہؐ کا اعلان ——— باقی بتانِ آذری۔

معذرت!

ہمیں افسوس ہے کہ علامہ تمنا عمادی صاحب کی چوتھی قسط بابت تنقید احادیث نزول مسیح علیہ السلام بروقت موصول نہ ہوسکنے کی وجہ سے اس رسالہ میں شامل نہیں ہو سکی۔

ترجمانِ حقیقت محترم پرویز صاحب کے قلم سے

سلیم کے نام خطوط

اسلامی عقائد و اعمال کی قرآن کی روشنی میں نہایت ہی سہل اور اچھوتے انداز میں نئی تشریح

ان خطوط میں ملت کے اس نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو مخاطب کیا گیا ہے جو شرق و مغرب کے تصادم کے بعد دورِ ملوکیت کے وضع کردہ غلط مذہبی تصورات سے متنفر ہوتے ہوتے اسلام اور اس کے سرچشمۂ حیات قرآن سے بھی ہاتھ دھو چلا تھا۔ علم کلام کے خشک اور نازک تر مسائل پر اس عمدگی سے بحث کی گئی ہے کہ محسوس ہی نہیں ہوتا کہ ہم کسی خشک فلسفیانہ بحث کو پڑھ رہے ہیں۔ باتوں باتوں میں وہ دقیق اور معرکۃ آرا مسائل حل کر کے رکھ دیئے گئے ہیں جنہیں ضخیم ضخیم مجلدات میں بھی حل نہیں کیا جا سکا تھا۔ یہ خطوط ملک کے گوشہ گوشہ سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ قرآن کی روشنی اور محترم پرویز صاحب کا بصیرت افروز قلم۔ ان خطوط کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اس مجموعے میں وہ خطوط بھی شامل ہیں جو طلوع اسلام میں شائع ہو چکے ہیں اور وہ بھی جو اب تک کہیں شائع نہیں ہوئے۔ کاغذ کی گرانی کے سبب کتاب کم تعداد میں طبع ہوئی ہے اسلئے جلدی آرڈر دیجئے ورنہ آپکو مایوس ہونا پڑیگا۔

کتاب بڑے سائز کے قریب سوا چار سو صفحات پہ پھیلی ہوئی ہے۔ کتابت و طباعت دیدہ زیب۔ کاغذ سفید۔ گرد پوش مصورِ مشرق جناب چغتائی کے حسین قلم کا مرقع۔ ان تمام خوبیوں کے باوجود قیمت صرف چھ روپے علاوہ محصولڈاک۔

روزمرہ زندگی کے اہم مسائل و معاملات کے متعلق

ہماری بصیرت کے مطابق

قرآنی فیصلے

دورِ حاضرہ کی عظیم الشان کوشش جس میں روزمرہ زندگی کے تقریباً ساٹھ اہم مسائل و معاملات کے متعلق قرآن کی روشنی میں بحث کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان مسائل و معاملات میں قرآن کا فیصلہ کیا ہے یہ کتاب آپ کو دوسرے تمام سہاروں سے بے نیاز کر دے گی۔ اسے فقہ کی کتاب نہ کہئے۔ اس سے قرآن کی بصیرت افروز راہنمائی حاصل ہو گی۔ ضخامت ۴۰۸ صفحات۔ قیمت مجلد چار روپے (علاوہ محصولڈاک)

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کوی روڈ۔ صدر کراچی

دنیا کی نجات

"فردوسِ گم گشتہ" کی ایک جھلک

[آجکل ادارۂ طلوعِ اسلام کے پیشِ نظر "فردوسِ گم گشتہ" کی اشاعت ہے۔ یہ مجموعہ ہے جناب پرویز کے ان مضامین کا جو انھوں نے وقتاً فوقتاً لکھے اور جو آج مختلف اوراق پر بکھرے ہوئے موتیوں کی طرح پڑے ہیں۔ اس نادر مجموعہ کی کتابت ہو چکی ہے اور عنقریب طباعت کے لئے پریس میں چلا جائیگا۔ زیرِ نظر مضمون اسی گلدستہ کی ایک پنکھڑی ہے۔ یہ مضمون جنوری ۱۹۴۲ء میں لکھا گیا تھا۔ گیارہ بارہ برس کا عرصہ ملاحظہ کیجئے اور پھر اس پنکھڑی کی تازگی اور شادابی محسوس فرمائیے۔ صاف نظر آجائیگا کہ جو شاخ قرآن کے سدرۃ المنتہیٰ سے نم کش ہو اس کے پھولوں کی تازگی میں کبھی فرق نہیں آتا۔ جنت تجری من تحتہا الانہار اسی کے لئے آیا ہے۔ - طلوعِ اسلام]

جاڑے کی کپکپاتی رات ہے۔ کرزن روڈ (نئی دہلی) پر وسیع پائیں باغ کے اندر ایک مرمریں قصرِ مزین کے بند روشندان کے شیشے سے بجلی کے لیمپ کی شعاعیں حسنِ بے پروا کی بیتابیٔ نمائش کی غمازی کر رہی ہیں۔ کمرہ ایرانی قالینوں، فرنگی صوفوں اور حریر و اطلس کے زرنگار پردوں سے دامانِ باغبان و کفِ گلفروش کی یاد تازہ کر رہا ہے۔ ساقی بجلوہ دشمنِ ایمان و آگہی اور مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے۔ بلوری ساغروں کی کھنک اور آتشِ سیال کی دمک، یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے۔ آتشدانوں میں کوئلہ دہک رہا ہے جس کے شعلے ابھر ابھر کر اس جہانِ رنگ و تعطر کو جھانکتے ہیں لیکن سرخیٔ غازہ اور رعنائیتِ صہبا کے سامنے ماند پڑ کر آتشِ حسد سے جل بجھتے ہیں۔ کیف و سرور کی اس دنیا میں کسی کو کسی کا ہوش نہیں اسلئے کہ یہ سب "انسان" ہیں۔ انھیں اس پر اختیار ہے کہ جب جی چاہے فطرت کے عطیہ عظمیٰ، امتیازِ انسانیت یعنی عقل و ہوش کو کھو دیں۔ لیکن جماد و نبات کو یہ اختیار حاصل نہیں۔ پتھر کا کوئلہ اپنے فریضۂ منصبی کی سرانجام دہی میں انتہائی جذب و انہماک سے سرگرمِ عمل ہے۔ وہ اس فضا کی ہوش ربا رنگینیوں سے متاثر نہیں وہ اپنی گیس کو برابر ہوا میں ملائے جا رہا ہے۔ دروازے، کھڑکیاں، روشندان سب بند ہیں۔ کمرے کی ہوا آہستہ آہستہ غیر محسوس طور پر مسموم ہوتی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ دم گھٹنے تک کی نوبت آ پہنچی۔ جو بالکل مدہوش و خود فراموش ہیں انھیں تو فطرت کی یہ تنذیر بھی نہیں چونکا سکی۔ لیکن جن میں ابھی شعور باقی ہے، انھیں فضا کی سمیت کا احساس ہوا، کوئی بیتابانہ دروازے کی طرف لپکا، کوئی کھڑکی کی جانب بھاگا۔ اسوقت نہ ساقی کا نازِ خرام ان کی راہ میں حائل ہوا، نہ نغمۂ مطرب کی دلکشی دامنگیر۔ نہ کسی کو صراحی کے ٹوٹ جانے کی پرواہ ہے نہ پیمانے کے لڑھکنے کا احساس۔ اس وقت تمام توجہات دروازوں اور کھڑکیوں پر مرکوز ہیں۔ باہر کسقدر سردی ہے اس کا بھی

کسی کو خیال نہیں، ہر ایک کی کوشش ہے کہ کسی طرح وہ سب سے پہلے باہر نکل جائے۔ اس افراتفری میں چٹخنیاں نہیں کھلتیں۔ اس نفسا نفسی میں ایک دوسرے کو روندنے اور مسلنے تک سے بھی گریز نہیں۔ یہ کیا ہوا؟ وہ محفل جو ابھی ایک ثانیہ پہلے، عیش وطرب کی جنت دکھائی دے رہی تھی کرب والم کی جہنم کیوں بن گئی؟ کیف وسرور کے وہ جاں نواز نظارے جن کے متعلق جی چاہتا تھا کہ کسی ساحر کے ہاتھ کی ایک طلسمی جنبش سے ہمیشہ کے لئے اپنے اپنے مقام پر منجمد ہو کر رہ جائیں تاکہ زمان ومکان کے حوادث ان میں کسی قسم کا تغیر وتبدل نہ پیدا کر سکیں، انھیں خود اپنے ہاتھوں سے یوں پریشاں کیوں کر دیا؟ اس لئے کہ خلاف فطرت فضا کی کثیف ہوا میں سانس لینے سے جان پر بن گئی اور جان بچانے کی غرض سے پھر فطرت کی کھلی فضا میں سانس لینے کے لئے تڑپ پیدا ہوئی۔ اپنے ہاتھوں سے بند کئے ہوئے دروازوں اور کھڑکیوں کے شیشوں کو سر مار مار کے توڑنا پڑا۔ آئین فطرت کی خلاف ورزی کب تک کی جا سکتی تھی۔ بند کمرے میں کوئلہ سلگانے کا فطری نتیجہ تھا کہ دم گھٹنے لگ جائے۔

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

انسان اور حیوان کی زندگی کا فرق

لیکن سانس کا مسئلہ تو انسان کی طبیعی زندگی (Physical Life) سے متعلق ہے اس میں انسان اور حیوان سب برابر ہیں۔ جس کمرہ میں ان تمام انسانوں نے اس طرح بھاگڑ مچائی۔ وہاں ان کے ساتھ دو تین کتے بھی تھے انھوں نے بھی انہی کی طرح دروازوں سے ٹکریں ماریں۔ وہ بھی باہر نکلنے کیلئے انہی کی طرح، بلکہ ان سے بھی زیادہ، بیقرار وبیتاب تھے۔ لیکن کیا انسان اور کتے میں کوئی فرق نہیں، کیا دونوں کی زندگی بس یہی طبیعی زندگی ہے؟ یہ تو غلط ہے۔ ابھی دم گھٹنے سے پہلے اس کمرہ میں جو کچھ ہو رہا تھا اس کی کیف ومستی میں کتے کا کوئی حصہ نہ تھا حالانکہ وہ بھی برابر کا شریک بزم تھا۔ سو ظاہر ہے کہ اس حصے کا تعلق زندگی کے کسی ایسے "شعبے" سے ہے جو حیوان اور انسان میں مشترک نہیں بلکہ انسان کے لئے مختص ہے۔ اور اگر یہ انسان کے لئے مختص ہے تو لامحالہ اس کا اثر بھی (اچھا ہو یا برا) "حیوانی زندگی سے ماوراء ہے۔ اور جب یہ کیفیت دنیائے لذت وطرب میں ہے تو ذمہ داریوں کی دنیا میں یہ اختصاص اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ یہ وہ اختصاص ہے جس کا تعلق "انسانیت" سے ہے جس طرح طبیعی زندگی کے لئے آئین وضوابط متعین ہیں اسی طرح دنیائے انسانیت کے لئے بھی دساتیر وقوانین مقرر ہیں۔ پھر جس طرح طبیعی زندگی سے متعلق آئین وضوابط کی خلاف ورزی سے مضر اثرات کا نمودار ہونا لازمی ہے اسی طرح انسانی زندگی سے متعلق قوانین سے سرکشی برتنے سے ضرر رساں نتائج کا مترتب ہونا تقاضائے فطرت ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ طبیعی زندگی سے متعلق اثرات کا احساس جلدی اور بدیہی طور پر ہو جاتا ہے اور انسانی زندگی سے متعلق نتائج وعواقب کیلئے وقت بھی درکار ہوتا ہے اور دیدہ وری بھی۔ یہ اثرات سر کی آنکھوں کے بجائے دل کی آنکھوں سے جلدی اور یقینی طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

تہذیب مغرب

اب ذرا کرزن روڈ کے متذکرہ صدر کمرہ کی دیواروں کو پھیلانا شروع کیجئے حتیٰ کہ یہ پھیلتے پھیلتے یورپ کے چاروں گوشے بن جائیں۔ جو کچھ اس کمرہ کے اندر ہو رہا تھا اس کا مجموعی نام تہذیب مغرب رکھ لیجئے۔ رنگ وچنگ کے سیلاب میں ڈوبے ہوئے مغرب کی نگاہیں حیوانی زندگی کے مقتضیات سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتی تھیں۔ انھوں نے

اشیائے فطرت کو مسخر کیا لیکن کس لئے؟ صرف اسلئے کہ وہ ان کی حیوانی خواہشات کے بروئے کار لانے کا ذریعہ بن سکیں۔ وہ ساقی و مطرب کی جلوہ ریزیوں اور عشوہ طرازیوں میں کچھ ایسے مدہوش ہوئے کہ انسانیت کے تقاضوں کی یاد ہی باقی نہ رہی۔ وہ اس طوفان کیف و مستی میں غرق تھے اور اس کا مطلقاً احساس نہ تھا کہ گردوپیش کی فضا میں کیا ہو رہا ہے لیکن جنھیں اللہ نے دیدۂ بینا عطا فرمایا تھا ان کی نگاہیں کوئلہ کی اس سموم گیس پر تھیں جو ہوا میں اس قدر کثافت پیدا کئے جا رہی تھی جس طرح ایک طبیب حاذق سنکھیا کھانے والے کے انجام کے متعلق بہت پہلے آگاہ کر سکتا ہے۔ اسی طرح ایک مردِ مومن، جسے اللہ تعالیٰ قرآنی بصیرت عطا فرمائے قوموں کی روشِ زندگی سے ان کے مآل کے متعلق اندازہ لگا لیتا ہے اور اس کے آئینہ ادراک میں وہ حوادث اپنی جھلک دکھا دیتے ہیں جو ابھی ضمیر فلک میں پہلو بدل رہے ہوں۔ اسلئے کہ جس طرح حیوانی زندگی سے متعلق فطرت کے قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں۔ اسی طرح انسانی زندگی سے متعلق بھی اس کے دساتیر و ضوابط ناقابلِ تغیر ہیں۔ (ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ہ) لہٰذا جس طرح ایک طبیب حاذق خواص الاشیاء کے علم کی بنا پر اس کا اندازہ لگا لیتا ہے کہ فلاں چیز کا طبعی نتیجہ کیا ہونا چاہیئے۔ اسی طرح ایک قرآنی مفکر اقوام و ملل کے امیال و عواطف کو میزانِ قرآنی میں رکھ کر یہ پہچان لیتا ہے کہ ان کی فلاں روش انھیں کس منزل کی طرف لئے جا رہی ہے۔ ایک ایسا ہی مردِ مومن تھا جس نے اپنی فراستِ ایمانی سے آج سے بہت پہلے کہہ دیا کہ

وہ فکرِ گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو
اسی کی بیتاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ (اقبالؒ)

لیکن مادہ پرستی کے نشہ میں سرشار مغرب کو ہوش کہاں تھا کہ وہ ان تنبیہات پر کان دھرتا۔ وہ اپنی روش میں مست رہا اور فضا کثیف سے کثیف تر ہوتی چلی گئی تاآنکہ اس کی سمیت اس حد تک بڑھ گئی کہ اس میں دم گھٹنے لگا اور آج حالت یہ ہے کہ صرف یورپ ہی نہیں بلکہ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں انسان اطمینان کا سانس لے سکے۔

عذابِ خداوندی

واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ ۚ واعلموا ان اللہ شدید العقاب ﴿۲۵﴾

اور اس فتنے سے بچتے رہو جو اگر اٹھا تو اس کی زد صرف انہی پر نہیں پڑے گی جو تم میں ظلم کرنے والے ہیں (بلکہ سبھی اس کی لپیٹ میں آجائیں گے) اور جان لو کہ اللہ کا قانون نتائج مرتب کرنے میں بڑا سخت گیر واقع ہوا ہے۔

دوسرے ساتھ اس لئے زد میں آجاتے ہیں کہ ——— قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو ——— اس زہر آلود تمدن کا سرچشمہ اگر یورپ تھا تو باقی دنیا بھی تو اس کی پرورش میں ممد و معاون تھی اس لئے یورپ کی بھٹیوں سے ابھرنے والی آگ کے شعلوں کی لپیٹ سے باقی دنیا کیسے محفوظ رہ سکتی؟ عذاب آیا اور اس انداز سے کہ جو جو شکلیں ذہنِ انسانی میں متصور ہو سکتی تھیں سب آنکھوں کے سامنے آگئیں۔

لہ ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "مومن کی فراست سے ڈرو اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے"۔ اللہ کا نور اس کی کتاب ہے۔

قل ھو القادر علی ان یبعث علیکم عذابا من فوقکم او من تحت ارجلکم او یلبسکم شیعا ویذیق بعضکم باس بعض (۶/۶۵)

کہدو کہ وہ اس پر قادر ہے کہ تم پر اوپر سے کوئی عذاب بھیجدے یا تمہارے پیروں تلے (نیچے سے) کوئی عذاب پیدا کردے یا ایسا کرے کہ تم گروہ گروہ ہو کر آپس میں لڑ پڑو اور ایک (گروہ) دوسرے (گروہ) کی شدت (قوت) کا مزہ چکھے[1]

غور فرمائیے! ان میں سے کونسی شکل ہے جو باقی رہ گئی ہے۔ آسمان سے عذاب، زمین سے عذاب، پانی میں عذاب، ایک قوم دوسری قوم سے برسرپیکار، ایک ملک دوسرے ملک کے خون کا پیاسا اور ایک دوسرے کی شدتِ قوت کا شکار اور پھر ایسے ایسے مقامات سے عذاب جو اس سے پیشتر وہم و گمان میں بھی نہ تھے۔ ابھی کل تک آسٹریلیا اور بحرالکاہل کے دیگر جزائر محفوظ ترین مقامات خیال کئے جاتے تھے لیکن آج یہ جگہیں سب سے زیادہ غیر محفوظ ہیں۔

فاتٰھم العذاب من حیث لا یشعرون (۳۹/۲۵)

ان پر ایسے ایسے مقامات سے عذاب آیا جو ان کی عقل و شعور (اور وہم و گمان میں بھی) نہ تھا۔

آرتھر مور کا تبصرہ

اس دم گھٹنے والی فضا میں جنھیں کچھ ہوش باقی ہے ان کے دل میں فطرت کی کھلی ہوا میں سانس لینے کے لئے تڑپ پیدا ہوئی ہے وہ ادھر ادھر دروازوں اور کھڑکیوں کی تلاش میں بیتابانہ دوڑ رہے ہیں انہی میں جریدہ اسٹیٹسمین کے مدیر مسٹر آرتھر مور بھی ہیں۔ یہ صاحب قلم، میدانِ صحافت و سیاست کے بالغ نظر شہسوار سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے سال گذشتہ متحارب ممالک کا دورہ کیا اور ان اسباب و علل کی تلاش میں سرگرداں رہے جو موجودہ خلفشار کا موجب ہیں۔ انھوں نے اپنی سمجھ کے مطابق ہر چیز کا بغور مطالعہ کیا اور اس کے بعد اپنے اخبار میں

"ہماری موجودہ جنگ"

کے عنوان سے ایک مسلسل مقالہ لکھنا شروع کیا جو گذشتہ ماہ سے التزاماً شائع ہو رہا ہے۔ انھوں نے اس مقالہ میں زندگی کے موجودہ مسائل کو بے نقاب دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ہر چند یہ کوشش ایسی کامیاب نہیں جیسی ہونی چاہئے تھی۔ اسلئے کہ وہ حقائق کا مطالعہ تنہا عقل کی روشنی میں کرنا چاہتے ہیں، علم خداوندی کی روشنی ان کے پاس نہیں۔ اور جب انسان کے پاس علمِ خداوندی کی روشنی نہ ہو تو اس کی حالت آسمان میں چمکنے والی بجلی کی روشنی میں چلنے والے کی سی ہوتی ہے کہ کلما اضاء لھم مشوا فیہ واذا اظلم علیھم قاموا (۲/۲۰) جب فضا اس کی چمک سے روشن ہو جاتی ہے تو دو چار قدم چل لیتے ہیں اور جب اندھیرا چھا جاتا ہے تو ٹھٹک کر رک جاتے ہیں۔ مسٹر مور کی طلب و جستجو اور تپش و خلش سے اتنا ضرور واضح ہو رہا ہے کہ مغرب اپنے غیر فطری نظامِ زندگی کے ہاتھوں کس درجہ تنگ آچکا ہے اور آئینِ فطرت کے مطابق نظامِ حیات کے لئے کس درجہ بیتاب ہے۔ مسٹر مور مختلف سیاسی نظریات و

---

[1] اس آیت کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کبھی عذاب اس شکل میں آتا ہے کہ اوپر کا طبقہ مستبد حکمرانوں کی طرح زیردستوں پر مسلط ہو جاتا ہے اور کبھی زیردست تنگ آکر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور معاشرہ کو تباہ و برباد کردیتے ہیں اور کبھی مخلوط پارٹیاں بن جاتی ہیں جو باہمدگر دست و گریباں ہوتی رہتی ہیں۔

رجحانات کے تذکرہ کے بعد لکھتے ہیں کہ

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم ایک عالمگیر جنگ کی مصیبت میں مبتلا ہیں اور یہ وہ چاکِ داماں ہے جس کی تدبیر رفو سے نہیں ہو سکتی یہ آگ ایک ملک سے دوسرے ملک تک پھیل کر رہے گی اور جب ہٹلر اور مسولینی ختم ہو جائیں گے تو ان کے بعد بھی صفحۂ ارض کے ایک بڑے حصے پر اس آگ کا سلسلہ جاری رہے گا۔ باہم خانہ جنگی یا مختلف طبقات کی لڑائی کی شکل میں اس مصیبت کا حل ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ جو لوگ آج ہٹلر کے انفرادی مقصد کے خلاف جنگ کر رہے ہیں۔ ان میں خود ایک مشترکہ اجتماعی مقصد اور عقیدہ پیدا ہو جائے۔ (اسٹیٹسمین ۲۶ ہلم)

اس اجتماعی عقیدہ یا مقصد کی تصریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:۔

ساکنانِ ارض کو ہم اندازاً دو طبقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ایک وہ جو کوئی نہ کوئی عقیدہ رکھتے ہیں اور دوسرے وہ جن کا کوئی عقیدہ نہیں۔ وہ نظام جدید جسے ایک طرف ہٹلر اور دوسری طرف اشتراکیین پیش کر رہے ہیں مستقبل کے متعلق ایک عقیدہ کی شکل لئے ہوئے ہے۔ . . . ان کے نظام جدید یا عقیدہ میں ارتقاء کا تصور ناگزیر ہے لیکن کس قسم کا ارتقاء؟ ایک اندھی قوت کا ارتقاء۔ ان کے ہاں عقل کو بڑا بلند درجہ دیا گیا ہے لیکن عقل کی کامیابی صرف اس میں ہے کہ وہ مادی تغلب اور اس کیلئے اجتماعی نظم و نسق پیدا کر دیتی ہے۔ . . . یہ تو ان کی کیفیت ہے جن کے ہاں مقصدِ زندگی ایک عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے ان کے برعکس دوسرے ممالک میں ایسے لوگ بھی ہیں جو نہ خدا کا عقیدہ رکھتے ہیں نہ ارتقاء کا۔ وطن پرستی۔ فرض منصبی کا احساس، غصہ، نفرت یا محض مجبوری ان کی قوتِ عمل کے محرکات ہیں۔ . . . . . . ارتقاء کی جدوجہد میں ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ بندر سے انسان تک کی ارتقاء کی کڑیاں تو تسلیم کر لیں گے لیکن یہ چیز ان کے تصور میں نہ آسکے گی کہ ارتقاء کا سلسلہ لامتناہی ہے اور اسے انسان سے آگے بھی بڑھنا ہے۔ (اسٹیٹسمین ۲۵ نومبر ۱۹۴۲ء)

یہ ہے مسٹر مور کے خیال کے مطابق دنیا کی موجودہ حالت۔ اب یہ دیکھئے کہ وہ اس مصیبت کا حل کیا تجویز کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

مصیبت کا حل

اس عالمگیر جنگ میں کامیابی حاصل کرنے اور ایک نظام جدید کو متمکن کرنے کیلئے مختلف مذاہب کے باہمی امتزاج سے ایک جدید مذہب کی تشکیل ایسی ہی ضروری ہے جیسی آلات و سامانِ حرب کو ایک مرکز پر اکٹھا کرنے کی (ایضاً)

مذاہب کے امتزاج سے ان کی مراد یہ ہے کہ مختلف مذاہب کی صداقتوں کو حشو و زوائد سے پاک کر کے ایک ایسے مذہب کی تشکیل کی جائے جو حیوانی ارتقاء کے بجائے لاہوتی ارتقاء (Divine Evolution) کا مؤید ہو۔ وہ لکھتے ہیں:۔

ہم اندھی ارتقاء کے عقیدہ کا جواب لاہوتی ارتقاء کے عقیدہ سے دیں گے بشرطیکہ یہ عقیدہ انسانیت کے مذہب کی حیثیت اختیار کر لے۔ ظاہر ہے کہ مذہب میں کچھ نہ کچھ صداقت ضرور ہوتی ہے یعنی ان مختلف مذاہب مثلاً عیسائیت اسلام، ہندومت، بدھ مت، یہودیت وغیرہ میں۔ (ایضاً)

آپ سردست اس پریشانی فکر و نظر کا چنداں خیال نہ کیجئے۔ صرف یہ دیکھئے کہ حیوانیت کی زندگی کو منتہائے نگاہ سمجھنے والے

خالص (مغربیت پسند) مذہب گزیدہ یورپ سے یہ کس قسم کی آواز اٹھ رہی ہے) اس کے بعد مسٹر آرتھر مور لکھتے ہیں:۔

بنیادی مشکل اس مسئلہ کے حل میں یہ ہے کہ انسان ایک مختار بالارادہ ہستی ہے یا مجبور محض "۔ (ایضاً)

اس کے بعد تحریر ہے کہ

دنیا کو آج اس چیز کی ضرورت ہے کہ اس سوال پر ارتقا کے مسلمہ نظریہ کی روشنی میں از سر نو غور و خوض کیا جائے۔

یہ غور و خوض کن خطوط پر ہونا چاہئے۔ اس کے متعلق رقمطراز ہیں۔

اسوقت جو کچھ ہمارے پاس ہے وہ مختلف مذاہب کا مجموعہ ہے ان میں سے اغلباً ہر ایک اس صداقت کو تبرکاً بطور یادگار محفوظ رکھے ہوئے ہے جسے اس کے بانی نے سمجھا لیکن یہ صداقتیں زمانہ قدیم کے مذہبی معتقدات اور فروعات میں کچھ اس طرح گھر گئی ہیں کہ حقائق نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں اور وہ دور حاضرہ کے انسان کیلئے ناقابل اطمینان صورت اختیار کر چکے ہیں۔ ہر ایک ملک میں روشن خیال طبقہ مذہب کو چیلنج دے رہا ہے اور اس طرح مذہب کی گرفت ہر جگہ ڈھیلی ہو چکی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ نفس مذہب (نہ کہ یہ مذہب اور وہ مذہب) اس انداز میں پیش کیا جائے کہ انسان کی بصیرت اسے تسلیم کرلے۔ مذہب پر ارتقا کے مسلمہ نظریہ کی روشنی میں از سر نو غور و فکر کی ضرورت ہے"۔ (ایضاً ۲۶ $\frac{11}{۵۳}$)

اس کے بعد مسٹر مور لکھتے ہیں کہ جامد مذہب نے (یعنی ایسے مذہب نے جو انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا ساتھ نہ دے سکے) لوگوں میں بے حسی اور تعطل پیدا کر رکھا ہے اسلئے اگر مذہب کو ارتقائی نظریہ کی روشنی میں پیش کیا جائے تو اس صورت میں

نسل انسانی کی تدریجی تکمیل اور زمین پر خدائی بادشاہت کا تصور ایک جوش انگیز امکانی شکل اختیار کرلے گا۔ (ایضاً)

اس کے بعد تحریر ہے۔

عروج وارتقا (Evolution) میں خدا کا تصور، جامد نظریۂ تقدیر اور ہر قسم کے تعطل اور بے حسی کا نقیض ہوگا۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم اگر کسی طرح یہ معلوم کر سکیں کہ "خدا کی مرضی" کیا ہے تو اس کا علم ہمارے اندر سحر پھونک دے گا اور اس طرح ہماری مرضی خدا کی مرضی کا گویا عکس بن جائے گی اور ہم ایک جدید مفہوم میں ارتقا کے اس لامتناہی ملکوتی ڈرامہ میں ایک با اختیار فعال ایکٹر کی حیثیت سے حصہ لے سکیں گے"۔ (اسٹیٹس مین ۲۶ر نومبر ۱۹۵۳ء)

آج دنیا جس عدم اطمینان و فقدان وسکون کے جہنم سے گذر رہی ہے اس کی علت بیان کرتے ہوئے مسٹر مور لکھتے ہیں۔

ایک ایسی دنیا میں جہاں مصنوعات، نوع انسانی کی خدمت کی غرض سے نہیں بلکہ اس مقصد سے تیار کی جائیں کہ ان کی فروخت سے دوسروں کا روپیہ بٹورا جائے۔ دولت سب سے اہم بن جاتی ہے۔ ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح روپیہ جمع کیا جائے۔ قوت اور حفاظت روپیہ کے اندر سمٹ کر آجاتی ہے۔ دولت کی ملکیت کامیابی کا نشان اور فخر و عزت کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔ آج کوئی پند و نصیحت اس جذبہ کو بدل نہیں سکتی۔ ۔ ۔ ۔ اس کیلئے جونہی ہمیں اس امر کا یقین ہو جائے کہ ہمارا موجودہ نظام معیشت ٹوٹ چکا ہے اور دوسرا کوئی ایسا نظام موجود ہے جو اس کی جگہ لے سکتا ہے تو ہمیں اپنا موجودہ نظام بدلنا پڑے گا۔ (اسٹیٹس مین ۲۸ $\frac{11}{۵۳}$)

ان اقتباسات میں جہاں ایک طرف صاحب مضمون کی پریشانیٔ فکر ونظر، ان کی بیتابیٔ قلب کی غماز بن رہی ہے، دوسری طرف طلب وجستجو کی تڑپ بھی ایک ایک لفظ سے جھلک رہی ہے۔ صاف نظر آرہا ہے کہ مسموم فضا کی کثیف ہوا سے دم گھٹ رہا ہے اور کھلی فضا میں سانس لینے کیلئے دروازوں اور کھڑکیوں کی تلاش میں دیوانہ وار جدوجہد ہو رہی ہے۔ مسٹر مور نے جو کچھ اپنے مقالہ کی ان تین چار اقساط میں لکھا ہے (جن کے اقتباسات اوپر دیئے جا چکے ہیں) اس کا ماحصل چند الفاظ میں یہ ہے کہ

ماحصل

(۱) دنیا کی موجودہ مشکلات ومصائب مغربی نظام تمدن کے ثمرات ہیں۔

(۲) وہ نظام تمدن جس میں منتہائے نگاہ حیوانی مقتضیاتِ زندگی سے آگے نہیں بڑھتا۔ جہاں انسان کو سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی سمجھ کر مستقبل کی ذمہ داریوں سے آزاد کر دیا جاتا ہے اور جہاں کامیابی، قوت اور عزت کا معیار دولت کا حصول واکتناز ہے۔

(۳) ہٹلر اور مسولینی فقط اس غیر فطری نظام کے مظاہر ہیں اسلئے اگر انہیں مغلوب بھی کر لیا جائے تو بھی دنیا میں امن قائم نہیں رہ سکتا۔

(۴) دنیا میں امن وسکون کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ ایک جدید نظام تمدن وعمرانیت کی بنا ڈالی جائے۔

(۵) وہ نظام جدید جس میں

(الف) انسان کو سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی نہ سمجھا جائے بلکہ اس سلسلہ کو لامتناہی خیال کیا جائے جس میں انسان کو اپنی تکمیل کیلئے عروج اور بلندی کے کئی اور مراحل طے کرنے ہیں یعنی ارتقائے حیوانی کی جگہ ارتقائے انسانی کا نظریہ پیدا کیا جائے اور

(ب) جس میں کامیابی، قوت اور عزت کا معیار دولت نہ ہو بلکہ جذبۂ خدمت ہو۔

(۶) اس نظام جدید کو بطور عالمگیر مذہب انسانیت پیش کیا جائے۔

(۷) اس مذہب کی تشکیل کیلئے مختلف مذاہب کی صداقتوں کا امتزاج کیا جائے کیونکہ مذہب کے اصلی حقائق ازمنۂ قدیم کی توہم پرستی اور فرعی مسائل کے پردوں میں چھپ چکے ہیں۔

(۸) مذہب کا مقصد جمود وتعطل نہ ہو بلکہ وہ انسان میں قوت عمل پیدا کرنے کا ذریعہ ہو جس سے انسان عروج وارتقا کے منازل طے کر سکے۔ نیز وہ بصیرتِ انسانی کو اپیل کر سکے۔

(۹) انسانی جدوجہد کا ماحصل یہ ہو کہ وہ کسی طرح مشیتِ خداوندی (خدا کی مرضی) معلوم کر سکے اور پھر اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کر دے کہ اس کی مرضی خدا کی مرضی بن جائے۔

(۱۰) اس طرح اس زمین پر خدا کی بادشاہت کا قیام ہو سکتا ہے۔

غور فرمایئے! عہد حاضر کے نظام زندگی کے ستائے ہوئے انسان کو جس چشمۂ سکون وراحت کی تلاش ہے ہر چند وہ اس کا پتہ پریشان الفاظ اور بکھرے ہوئے نشانات سے دے رہا ہے لیکن اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ وہ ٹھیک وہیں پہنچنا چاہتا ہے

جہاں قرآن پہنچاتا ہے۔ اسلام کے بنیادی خط وخال ہمارے سامنے ہیں۔ ان پر غور فرمائیے۔

اسلام کے بنیادی خط وخال

(۱) اسلام میں نظامِ زندگی کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے جو ایک عبدِ مسلم کے فکر ونظر اور اعمال واحوال کے تمام گوشوں کو محیط ہے۔ توحید سے مفہوم یہ ہے کہ حاکمیت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے یعنی انسان کو (خواہ وہ ایک فرد ہو یا افراد کا مجموعہ) دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور دنیا کے تمام انسانوں کو صرف قوانین خداوندی کی اطاعت کرنی چاہیئے کیونکہ خدا کی حاکمیت کے معنی اس کے قوانین کی اطاعت ہے۔ وحدتِ خالق کے عقیدہ کا دوسرا فطری نتیجہ وحدتِ خلق ہے یعنی یہ عقیدہ کہ دنیا میں تمام انسان ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ نسل یا ملک کی تقسیم سے انسانیت کی تقسیم نہیں ہوسکتی۔ اسی ایک عقیدہ سے وہ تمام اقتصادی۔ سیاسی۔ معاشی معاشرتی۔ عمرانی مسائل خود بخود حل ہوجاتے ہیں جو آج انسان کے گرد ماہی پیچاں کی طرح لپٹے ہوئے ہیں اور اس کی زندگی کو جہنم بنا رہے ہیں آج ایک نسل دوسری نسل کے ساتھ برسرِ پیکار ہے۔ ایک ملک دوسرے ملک کے خلاف فوج کشی کر رہا ہے۔ ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ نبرد آزما ہے یہ سب اس لئے کہ وحدتِ خلق کے بجائے نوعِ انسانی کو غیر فطری امتیازات سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا ہے۔ دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ کو کاٹ رہا ہے اور نہیں سمجھتا کہ یہ اپنا ہی دست بازو ہے کسی غیر کا نہیں۔ معدہ اس فکر میں ہے کہ جو خوراک اس میں جا پہنچی ہے اسے اپنی ہی چار دیواری میں محبوس کرلے۔ ادھر دل وجگر کی یہ کوشش ہے کہ خوراک کو معدہ تک پہنچنے ہی نہ دیا جائے بلکہ حلق سے نیچے اترتے ہی جھپٹ لی جائے جس جسم کے نظام میں اس قسم کی نفسا نفسی پیدا ہوجائے اس کا انجام معلوم!

(۲) پھر جیسا کہ ارتقاء سے متعلق مضامین میں وضاحت سے بیان کیا جا چکا ہے۔ اسلام کے نزدیک موجودہ انسان، سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی نہیں بلکہ یہ سلسلہ آگے بڑھے گا۔ اس وقت تک صرف حیوانیت کا ارتقا تھا۔ اب انسانیت کا ارتقا شروع ہوگا۔ انسانیت اس وقت شروع ہوتی ہے جب اس پیکرِ حیوانی میں صفاتِ الٰہیہ کا عکس وکرشمہ نمودار ہوتا ہے۔ انسان جسقدر ان صفات کو نشوونما دیتا چلا جائے گا اسی قدر اس کی انسانیت مستحکم ہوتی جائے گی۔

(۳) اسلام بتاتا ہے کہ انسانیت کا نشو وارتقاء زندگی کو ان قوانین کے ماتحت بسر کرنے سے ہوتا ہے جو خدائے رب العٰلمین کی طرف سے ملے ہیں۔ ان قوانین کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ یہی حکومتِ الٰہیہ کا ضابطہ آئین ہے۔ فطرت کے دیگر قوانین کی طرح اس ضابطے کے اصول بھی غیر متبدل اور ناقابلِ ترمیم وتنسیخ ہیں اور بلا لحاظ زمان ومکان تمام نوعِ انسانی کے لئے ہیں۔ ان اصولی ضوابط کی روشنی میں ہر زمانہ کے اقتضاأت کے مطابق فرعی قوانین مرتب کئے جائیں گے اور اس طرح یہ نظامِ زندگی ایک جامد وساکن مذہب کے بجائے، انسان کی بڑھتی ہوئی ضروریات کے ساتھ ساتھ ہر مقام پر راہ نمائی کرتا جائے گا۔ قرآن انسانی عقل وبصیرت کو اپیل کرتا ہے اور اس کے علم وشعور کی پرورش چاہتا ہے۔ اسلئے اس میں توہم پرستی یا اندھی تقلید کو کوئی دخل نہیں۔

(۴) اسلام چند افراد کا نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کا عروج وارتقاء چاہتا ہے اسلئے اس کا نظامِ زندگی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ اس کی ہیئتِ اجتماعیہ کا مرکز خدا کی حاکمیت کا اقرار ہے۔ جس جماعت میں یہ اقرار محسوس طور پر متشکل ہوتا ہے اس کا نام

ملت اسلامیہ ہے جس کی شیرازہ بندی ختم نبوت کے عقیدہ سے وابستہ ہے یعنی یہ ملت، ملتِ واحدہ ہوگی۔ مختلف پارٹیوں میں منقسم نہیں ہوگی۔ ختم نبوت کا عقیدہ انسانی عقل و شعور اور فکر و تدبر کے نشو و ارتقاء کا بھی حامل ہے۔ وحی کے ذریعے نظامِ زندگی کے اصول متعین ہو گئے۔ ان اصولوں کے ماتحت جزئیات کی تشکیل انسانی تفقہ و تدبر کی رو سے ہوگی۔

(۵) اسلامی ہیئت اجتماعیہ میں کامیابی، قوت اور عزت کا مدار دولت نہیں بلکہ شرف انسانیت ہے جس میں یہ شرف (استحکام خودی) زیادہ ہوگی وہ سب سے زیادہ واجب الاحترام ہوگا۔ دولت اور قوت انسانیت کی فلاح و بہبود کیلئے صرف کی جائے گی۔ افراد یا کسی خاص گروہ کے استیلاء و تغلب کا ذریعہ نہیں بن جائے گی۔ اس لئے اسلامی نظام زندگی میں اکتناز کی بھی اجازت نہیں، نہ ہی اس امر کی کہ دولت صرف بالائی طبقہ میں ہی گردش کرتی رہے نیچے کے طبقے میں آئے ہی نہیں۔ اس میں رزق کے سرچشمے عام انسانوں کیلئے یکساں طور پر کھلے رہیں گے۔ قرآن کریم کی نصوص صریحہ ان امور پر دلالت کرتی ہیں۔

(۶) یہ ہیئت اجتماعیہ جس کی وسعتیں زمان و مکان کی حدود سے محصور نہیں ہوں گی۔ نظام انسانیت کو (ضابطۂ خداوندی) کے مطابق چلانے کی ذمہ دار ہوگی اور اس طرح خدا کی بادشاہت زمین پر قائم ہو جائے گی۔ انسان کو "خدا کی مرضی" اس کے قوانین کے ذریعے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ سو جب انسان اپنی مرضی کو خدا کے قوانین کے تابع کر لے تو اس کی مرضی عین خدا کی مرضی ہو جاتی ہے۔ اس طرح انسان ایک طرف مختار بالارادہ اور دوسری طرف مجبور ہوگا۔ مجبور اس لئے کہ اپنے آپ کو ایک آفاقی نظام کے اصولوں کے تابع رکھے گا۔ اور مختار اس لئے کہ اس جبر سے جو اختیار پیدا ہوگا وہ اسے اس قابل بنا دے گا کہ تمام کائنات کو مسخر کر لے۔ استحکام خودی اور جوش کردار سے یہ اس مقام بلند پر جا پہنچے گا کہ خدا کے سوا کوئی اور قوت اس پر غالب نہ ہوگی۔

(۷) اس ہیئت اجتماعیہ میں ہر فرد اپنے آپ کو خدا کے سامنے جوابدہ سمجھے گا اس لئے معاملات کی دنیا میں جادۂ عدل و انصاف سے ادھر ادھر نہیں ہٹ سکے گا یہ جوابدہی اس خدا کے سامنے ہوگی جو دل کی لغزشوں اور نگاہ کی خیانتوں سے واقف ہے اس لئے خدا کے اس بندے کے اعمال و افعال حاضر و غائب یکساں ہوں گے کیونکہ تمام افعال قانونِ مکافات عمل کے تابع رہیں گے۔

یہی "جوابدہی" سے مقصود ہے۔ اس نظام میں ہر شخص کو اسکا حق ملتا چلا جائیگا اور کوئی کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہوگا۔

کس نباشد در جہاں محتاج کس نکتۂ شرع مبیں این است و بس (اقبالؒ)

یہ ہے مختصراً وہ "مذہب" جس کی آج مسٹر آرتھر مور اور ساری دنیا کو تلاش ہے۔ لیکن مسٹر مور سچا ہے جب وہ یہ کہتا ہے کہ اس قسم کا مذہب مختلف مذاہب کے امتزاج سے پیدا کرنا چاہئے اس لئے کہ اس قسم کا مذہب کہیں نظر نہیں آتا۔ آپ کہیں گے کہ جب اس قسم کا مذہب (اسلام) موجود ہے تو پھر مسٹر مور کو نظر کیوں نہیں آتا؟ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ اسے اسلام نظر کہاں سے آئے؟ موجودہ مسلمانوں کی زندگی میں تو اسلام نظر نہیں آسکتا۔ باقی رہے اس کے ماخذ۔ سو وہ اندھی تقلید و روایات کی چادروں میں اس طرح لپٹے ہیں کہ غیر تو غیر خود اپنوں کیلئے بھی نگاہوں سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ اب اسلام نام ہے چند رسومات کا جن سے مدت ہوئی

روح نکل چکی ہے۔ یا نام ہے باہمی سرپھٹول کا جس کا نتیجہ ہماری موجودہ زندگی ہے جس سے ہم خود نالاں ہیں یہ کہئے کہ یہ مذہب تسکین و عروج کے متلاشیوں کیلئے کس طرح جاذب نگاہ بن جائے۔ آج اسلام کے لئے دنیا بے قرار ہے لیکن یا للعجب! کہ تمام عالم اسلامی میں خدا کا ایک بندہ ایسا نہیں جو اسلام کو اس کے صحیح خط و خال میں دنیا کے سامنے پیش کر سکے۔ مسلمانوں میں جو لوگ مغرب کے کرب الم اور اس کے اسباب و علل سے واقف ہیں وہ اسلام سے بیگانہ ہیں اور جو مذہب کے علمبردار ہونے کے مدعی ہیں ان بچاروں کو اپنے آپ کی بھی خبر نہیں۔ اسلئے ظہر الفساد فی البر والبحر (خشکی اور تری میں ہر جگہ فساد ہی فساد ہے) اب جو یان حقیقت تک اسلام کا پیغام کون پہنچائے! صدیوں کے بعد مبدا رفیض کی کرم گستری سے ایک ایسا مرد دانا پیدا ہوا تھا جو ایمان و حکمت، ذکر و فکر، عشق و عقل یعنی مشرق و مغرب کا مقام اتصال تھا۔ لیکن (اسے ہماری شوریدہ بختی کہئے کہ) وہ ابھی مغرب کو اس کے نظامِ تمدن کے انجام و عواقب سے آگاہ ہی کر رہا تھا کہ اسے واپس بلا لیا گیا۔ اس وقت چونکہ مغرب کے سامنے اس کے نظام کے اثرات محسوس طور پر بے نقاب نہیں ہوئے تھے اسلئے اس مرد دانا کی باتوں کو "پرانے زمانے کے پند و نصائح" سمجھ کر ٹال دیا گیا۔ آج جب وہ آتش فشاں پہاڑ پھٹا اور سارا یورپ (بلکہ تمام دنیا) اسکی لپیٹ میں آ گیا ہے اگر وہ مفکر قرآنی زندہ ہوتے تو وہ اس پوزیشن میں تھے کہ مفکرین مغرب کو مخاطب کر کے اسلام کا پیغام دیتے اور وہ ان کی سنتے بھی اور سننے کے بعد اس پر غور بھی کرتے۔ انھوں نے آج سے بہت پہلے یورپ کے نام یہ پیغام بھیجا تھا۔

از من اے بادِ صبا گوئے بدانائے فرنگ — عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را ایں بجگر می زند آں رام کند — عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است
چشم جز رنگ گل و لالہ نہ بیند ورنہ — آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است
عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری! — عجب ایں است کہ بیمارِ تو بیمار تر است
دانش اندوختۂ دل ز کف انداختۂ — آہ ازاں نقدِ گرانمایہ کہ در باختۂ!

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است — بالِ بلبل دگر و بازوئے شاہیں دگر است
دگر است آنکہ برد دانۂ افتادہ ز خاک — آں کہ گیرد خورش از دانۂ پرویں دگر است
دگر است آنکہ زند سیرِ چمن مثلِ نسیم — آنکہ در شد بہ ضمیرِ گل و نسریں دگر است
دگر است آنسوئے نہ پردہ کشادن نظرے — ایں سوئے پردہ گمان و ظن و تخمیں دگر است
اے خوش آں عقل کہ پہنائے دو عالم با اوست — نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست

اور اس کے بعد فرماتے ہیں:

وقت آں است کہ آئینِ دگر تازہ کنیم — لوحِ دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم!

یہی "آئینِ دگر" ہے جسے آج ساری دنیا (New Order) کے نام سے پکار پکار کر ڈھونڈھ رہی ہے۔ اس "آئینِ دگر" کی وجۂ جواز یہ تھی کہ

چشم بکشائے اگر چشمِ تو صاحب نظر است　　زندگی درپئے تعمیر جہانِ دگر است

اسوقت دنیا کی نگاہیں تہذیب نو کی تابندگی سے خیرہ ہو رہی تھیں اسلئے وہ اس "جہان دگر" کو کس طرح دیکھ سکتی تھی۔ یہ جہانِ نو تو اسے ہی نظر آسکتا تھا جس کی آنکھیں قرآنی فراست سے منور تھیں۔ اس نے اس جہان کو دیکھا اور برملا کہہ دیا کہ

من دریں خاک کہن گوہرِ جاں می بینم　　چشم ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم

دانہ را کہ باغوش زمیں است ہنوز　　شاخ در شاخ وبرومند وجواں می بینم

کوہ راشل پرکاہ سبک می یابم　　پرکاہے صفتِ کوہ گراں می بینم

انقلابے کہ نہ گنجد بہ ضمیر افلاک　　بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم

خرم آنکس کہ دریں گرد سوارے بیند　　جوہرِ نغمہ ز لرزیدنِ تارے بیند

یہ ہے وہ بصیرت و فراست جو قرآن کریم عبد مسلم کو عطا کرتا ہے۔ کس قدر حسرت انگیز ہے یہ تصور کہ اس مرد حق شناس کو عمر بھر یہ آرزو رہی کہ

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

لیکن آج پورے کا پورا "جنوں کدۂ فرنگ" مقامِ کبریا کی تلاش میں ہے لیکن وہ مرد مومن موجود نہیں جو اسے بتا سکے کہ مقامِ کبریا کیا ہے؟

بایں ہمہ ہمارے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ خدائے حی وقیوم کی زندہ و پائندہ کتاب دنیا میں موجود ہے چونکہ یہ کتاب قیامت تک کیلئے نوع انسانی کا نصاب ہے اسلئے اس نور بصیرت کے عام ہونے کی تدبیر ہو کر رہے گی۔ ہمیں تو صرف اتنا افسوس ہے کہ مسلمانوں کے سامنے سعادت و خوش بختی کا ایسا نادر موقعہ آیا اور یہ اس سے یوں محروم رہ گئے۔ شاید ان کے جرائم کی پاداش ایسی ہلکی نہیں جو اتنی جلدی ختم ہو جائے۔

لیکن ہم لاکھ خطا کار سہی۔ کیا اس کے سحاب کرم کی گہرباری سے اتنی بھی امید نہ رکھیں کہ اس دانہ کو جو ہنوز آغوشِ زمیں میں پیوست ہے، اپنی آنکھوں سے "شاخ در شاخ وبرومند وجواں" دیکھ لیں۔ وہ گرد جو آج ساری دنیا کے مطلع کو مکدر کئے ہوئے ہے چھٹ جائے اور اس کے اندر سے وہ "سوار اشہب دوراں"[1] جسے دیکھنے کے لئے آسمان کی آنکھیں بھی ترس گئی ہیں، باہمہ جبروت و ملکوت ہمارے سامنے وجہ شادابی عالم ہو جائے اور ایک بار پھر اس زمین پر آسمان کی بادشاہت کا تختِ اجلال بچھ جائے۔

اے وہ کہ جس کی رحمت تمام کائنات پر چھائی ہوئی ہے۔ کیا تیری درگاہ سے یہ نمناک آنکھیں مایوس لوٹ آئیں گی؟

الٰہی تو تو رب العٰلمین ہے!!

---

[1] وہ مرکز ملت جو ہم میں سے ہمارے اوراق کی شیرازہ بندی اور قرآنی نظام کے قیام کا موجب بنے۔

ادارۂ طلوع اسلام کی تازہ پیشکش

جشن نامے

مسکراہٹوں اور آنسوؤں کا مرقع، نشتروں اور مرہموں کا مجموعہ، ہماری چھ سالہ آزادی کی زندگی پر محتسبانہ تبصرہ اور ہمارے دکھوں کا مشفقانہ مداوا۔ اردو لٹریچر میں اس نوعیت کی دوسری کتاب نہیں ملے گی۔

فہرست عنوانات ملاحظہ کیجیے۔

پنکھڑیاں

- انسانیت کی موت
- اے چشم اشکبار ذرا دیکھ تو سہی / یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو
- جب ہماری حکومت آئیگی تو
- ذرا سوچیے
- پاکستانی مسلے
- ملاح کی اصلاح
- ہماری رفتار ترقی
- آگ ہے اولاد ابراہیم ہے نمرود ہے / کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے
- قوم کے غم میں

- لیڈرانیاں
- مجاہدانہ رنگینیاں
- آدمی نہیں ملتے
- رکشا والا
- چائے کا دور
- چائے کا دور (تصویر کا دوسرا رخ)
- شاعری نے مار ڈالا اس قوم کو
- اتاترک کا آخری پیغام
- ہر شخص چاہتا ہے کہ
- مظلومین کشمیر کی یاد میں تفریحات
- " " " پارٹیاں
- اسلامی حکومت
- رام داس

- تھرڈ کے جوکر
- مادر پدر آزادی
- مجبوریاں
- پارٹیاں
- محفل نمائش
- پاکستان کا نیا کلچر
- تمام شہر کے دو چار دس کی بات نہیں
- رکشا والا
- اہم تبدیلی
- نظریۂ اضافیت
- جشن آزادی ۱۹۴۸ء

- نذر عقیدت
- ۱۵ اگست
- جشن آزادی ۱۹۴۹ء
- ۱۵ اگست کا پیغام
- جشن آزادی
- جشن آزادی ۱۹۵۰ء
- ۱۵ اگست کا پیغام
- جشن آزادی
- جشن آزادی ۱۹۵۱ء
- جشن آزادی ۱۹۵۲ء
- یہ ہمارا خواب تھا
- یہ خواب کی تعبیر ہے
- جشن آزادی

ضخامت ۳۵۶ صفحات - مجلد مع گرد پوش - قیمت اڑھائی روپے

بہت جلد طلب کیجیے کیونکہ کاغذ کی کمیابی کی وجہ سے کتاب محدود تعداد میں چھاپی گئی ہے

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کوی روڈ۔ (نزد پیراڈائز سینما) صدر کراچی

رفتارِ عالم

کوریا سے متعلق مذاکراتِ امن بدستور دردِ سر بنے ہوئے ہیں اور ان میں ایسا تعطل رونما ہو رہا ہے جو خلافِ توقع تو نہیں لیکن منافیٔ امن ضرور ثابت ہو سکتا ہے۔ معاہدہ التوائے جنگ کی رو سے کوریا کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک سیاسی کانفرنس کو ۲۸ اکتوبر تک کاروبار شروع کر دینا چاہیئے اس کی ترکیب پر ابھی تک فریقین کا اتفاق نہیں ہو سکا۔ امریکہ نے اقوام متحدہ سے یہ تجویز پاس کرا لی ہے کہ مجوزہ کانفرنس میں اقوام متحدہ کی نمائندگی وہی سولہ اقوام کریں جو کوریا کی جنگ میں عملاً شریک ہوئی تھیں ایسی کانفرنس سے اشتراکی گروہ کو کچھ حاصل نہیں ہو سکتا اس لئے اس کی کوشش یہ ہے کہ ارکان کی تعداد میں اضافہ کرا لیا جائے تاکہ کچھ ایسے نمائندے اس میں شریک ہو سکیں جو ان کے مطلب کی بھی بات کر سکیں۔ چین نے اس ضمن میں پانچ قوموں کے نام دیئے تھے جو منظور نہیں کئے گئے۔ یہ تعطل باقی ہے اور ۲۸ اکتوبر کی تاریخ سر پر آ چکی ہے اس تاریخ تک کارروائی شروع نہ ہو سکی تو جنوبی کوریا کے صدر سنگمن ری "جنگ کی طرح ڈال دے گا" کم از کم اس کا اعلان یہی ہے اس اعتبار سے یہ تاریخ نہایت اہم ہے۔ اگر ری کو قابو میں رکھا جا سکا تو توقع ہے کہ شاید مزید گفتگوئے مصالحت سے بات آگے بڑھ سکے لیکن اگر ایسا نہ ہوا اور ری نے کوئی عاجلانہ قدم اٹھا لیا تو بظاہر امن کی فضا جنگ میں تبدیل ہو جائے گی۔

ری کے لئے جھگڑا کھڑا کرنے کی ایک اور صورت بھی موجود ہے کوریا میں یہ مسئلہ بھی طے ہو رہا ہے کہ فریقین کے وہ قیدی جو اپنے گھروں کو واپس جانا نہیں چاہتے انہیں کیسے سمجھایا جائے۔ ایسے قیدیوں کی تعداد تئیس [۲۲] ہزار کے قریب ہے ان میں بائیس ہزار چھ سو چینی اور شمالی کوریا کے باشندے ہیں وہ بضد ہیں کہ اشتراکی ماحول میں واپس نہیں جائیں گے اس وقت ہندوستان کی صدارت میں جو پنج ارکانی کمیشن کام کر رہا ہے اس نے افہام و تفہیم کا یہ لائحہ عمل مرتب کیا ہے کہ تمام قیدی متعین مراکز پر لائے جائیں وہاں ان کی حاضری لازمی ہو اور ہفتے میں چھ دن کے لئے روزانہ آٹھ گھنٹے انہیں وہاں موجود رہنا پڑے ہر قیدی بار بار بلایا جا سکتا ہے پورا عرصہ افہام و تفہیم کے لئے تین ماہ کا ہے یہ طریق اس سے مختلف ہے جو اقوام متحدہ نے تجویز کیا تھا لیکن ہندوستان نے اسے ٹھکرا کر ایسا طریق تجویز کیا ہے جو بظاہر اشتراکیوں کے مفاد کے مطابق ہے۔ اس افہام و تفہیم کا سلسلہ شروع نہیں ہوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مرحلہ بآسانی طے ہو جائے گا۔ خود اشتراکی قیدی جو اپنے وطن کو واپس نہیں جانا چاہتے ایک حد تک عدم تعاون کا مظاہرہ کر رہے ہیں اس سے ہنگامے پیدا ہو رہے ہیں یہاں تک کہ ہندوستانی سپاہی گولیاں چلا کر انہیں قابو میں رکھ رہے ہیں اس وقت تک ان ہنگاموں میں دو تین سپاہی ہلاک بھی ہو چکے ہیں جنوبی کوریا کے صدر ری ان ہنگاموں سے فائدہ اٹھا کر مزید ہنگامہ زدگی کر سکتے ہیں لیکن وہ کس حد تک جا سکتے ہیں اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

امن کا محاذ کوریا کے علاوہ عمومی محاذِ امن پر بھی کچھ نہ کچھ تبدیلیاں ہو رہی ہیں یوں تو "مشرق و مغرب" میں ابھی تک تعطل پایا جاتا ہے

لیکن اب فکر و عمل کا رخ اس طرف آتا جا رہا ہے کہ اس تعطل کو کیسے ختم کیا جائے مغرب کے لئے یہ تعطل ایک حد تک مضر ہے کیونکہ جوں جوں تعطل طول پکڑتا جاتا ہے تو ان کے باہمی اختلافات بھی ابھرتے جاتے ہیں گویا مغربی اتحاد کے لئے اشد ضروری ہے کہ روس سے کوئی فیصلہ کن بات کی جائے اول تو امریکہ کی پالیسی روس کے معاملہ میں یہ تھی کہ اگر روس امن چاہتا ہے تو کوریا، جرمنی، انڈوچائنا وغیرہ میں اپنی صدق دلی کا ثبوت دے لیکن اب اس موقف میں تبدیلی آتی جا رہی ہے اور امریکہ کی خارجہ پالیسی ڈیموکریٹک پارٹی کے شکست خوردہ صدر ایڈلائی سیٹونسن کے اس نظریئے کے مطابق ہوتی جا رہی ہے کہ امریکہ کو چاہیئے کہ وہ روس کو "عدم تجاوز" (NON - AGGRESSION.) معاہدہ کی پیشکش کرے اگر روس اس تجویز کو مان لے تو اس فضا میں باقی ماندہ معاملات پر بھی گفتگو سے مصالحت ہو جائے گی۔

سر ونسٹن چرچل کے چھٹی سے واپس آجانے سے مذاکراتِ امن کو کافی تقویت ملنے کی توقع ہے چرچل نے گذشتہ مئی میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ چار رئیسانِ مملکتِ عظمےٰ کی کانفرنس "بلا غیر ضروری تاخیر" طلب کی جائے لیکن ان کی جبری غیر حاضری سے اس تجویز کی مناسب پیروی نہیں ہو سکی اب قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ اس کے حق میں فضا سازگار کریں گے چنانچہ انھوں نے اس کا اعلان بھی کیا ہے۔ ان ہی دنوں ان کے ایماء سے لندن میں امریکہ، فرانس اور انگلستان کے وزرائے خارجہ کی کانفرنس ہوئی ہے اس کانفرنس میں روس کی اس یادداشت کا جواب دیا گیا ہے جو مغربی یادداشت مورخہ ۲ ستمبر ۵۳ء کے جواب میں تھی۔ مغربی تجویز یہ تھی کہ لوگانو (سوئٹزرلینڈ) میں ۱۵ اکتوبر تک دولِ اربعہ کے نمائندوں کی کانفرنس منعقد کی جائے جو آزاد اور متحد جرمنی اور آسٹریا کے معاہدے کے متعلق تصفیہ کرے۔ روس نے اس کے جواب میں پیشکش کی کہ دولِ خمسہ کی کانفرنس ہو (پانچواں رکن سرخ چین ہوگا) جو بین الاقوامی کشیدگی کم کرنے کے ذرائع پر غور کرے اس کے ساتھ ہی دولِ اربعہ کی ایک کانفرنس ہو جو جرمنی کے متعلق ہو لیکن اس میں یہ مسائل بھی زیرِ بحث لائے جا سکیں۔ روس کا یہ جواب مغربی نقطۂ نگاہ سے مایوس کن تھا اس کے جواب میں مغربی قوتوں نے روس کو پھر دعوت دی ہے کہ وہ ۹ نومبر کو لوگانو کانفرنس میں شرکت کرے جس میں صرف جرمنی اور آسٹریا کو زیرِ بحث لایا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب روس کی طرف سے حوصلہ افزا نہیں ہو سکتا لیکن جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے ان بظاہر لاطائل مذاکرات میں خوش آئند علامات یہ ہیں کہ امریکہ کی پالیسی میں تبدیلی آرہی ہے اور انگلستان چاروں ملکوں کی کانفرنس پر مصر نظر رہے اگر واقعی ان ممالک کے قائدینِ اعلیٰ باہم مل سکیں تو بات کچھ آگے بڑھ سکتی ہے۔

ٹریسٹ کا قضیہ

مغربی لباطِ سیاست پر تازہ واقعہ ٹریسٹ کا ہے جس نے اچھا خاصا ارتعاش پیدا کر دیا ہے یہ مختصر سا علاقہ گذشتہ جنگ کے خاتمے کے بعد سے اب تک بدستور وجہ نزاع بنا ہوا ہے جب جرمن فوجیں اس علاقہ سے نکلیں تو ایک طرف سے یوگوسلافیہ کی فوجیں اس میں داخل ہوئیں اور دوسری طرف سے برطانیہ کی چنانچہ ایک حصہ یوگوسلافیہ کے قبضے میں آگیا لیکن یوگوسلافیہ تمام علاقے کا الحاق چاہتا ہے اس کے مقابلے میں اٹلی بھی تمام علاقے کا مطالبہ کر رہا ہے اتفاق سے آبادی کی اکثریت اطالویوں پر مشتمل ہے اس لئے اٹلی نے یہ تجویز کی ہے کہ تنازع کا فیصلہ استصوابِ رائے سے کیا جائے لیکن ظاہر ہے کہ یوگوسلافیہ اسے قبول نہیں کر سکتا۔ جنگ کے بعد ٹریسٹ کا علاقہ مغربی اقوام کے قبضہ میں آیا تو اس وقت یوگوسلافیہ روسی حلقۂ اثر میں تھا اس اعتبار سے ٹریسٹ مشرق و مغرب کی حدِ فاصل تھا لہٰذا اس کو یوگوسلافیہ کی تحویل میں دے دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا چنانچہ بتدریج مغربی اقوام نے اپنے زیرِ اقتدار حصہ میں اٹلی کا انتظامی اثر و نفوذ بڑھانا شروع کر دیا۔ بالآخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ انھوں نے ۵ اکتوبر کو یہ اعلان کر دیا کہ وہ عنقریب متعلقہ حصہ سے اپنی فوجیں نکال لیں گے اور علاقہ اٹلی کے حوالہ کر دیں گے

اس اقدام کی ضرورت اس لئے بھی پیش آئی کہ اٹلی کے اندرونی حالات تسلی بخش نہیں۔ حالیہ انتخابات نے یہ حقیقت نمایاں کر دی ہے کہ وہاں اشتراکی عناصر کا اثر بڑھ رہا ہے اور مغرب پرستوں کا اثر گھٹ رہا ہے چنانچہ سابق وزیر اعظم ڈی گسپری اپنی حکومت از سر نو مرتب نہیں کر سکے اس سے اقوام مغرب نے یہ سوچا کہ ٹریسٹ کا علاقہ اٹلی کے حوالہ کر کے برسر اقتدار پارٹی کی ساکھ قائم کی جائے لیکن اس نے یوگوسلافیہ کو چراغ پا کر دیا اور وہاں کے صدر مارشل ٹیٹو نے اعلان کر دیا کہ اگر مغربی افواج ٹریسٹ کے علاقے سے ہٹالی گئیں تو وہ متعلقہ علاقہ اٹلی کی تحویل میں نہیں جانے دے گا بلکہ اپنی فوجیں داخل کر کے اس پر قبضہ کر لے گا۔

روس نے حسب عادت اس قضیہ کو کافی اہمیت دی اور اسے اطالوی معاہدۂ امن کی خلاف ورزی قرار دیتے ہوئے اقوام متحدہ میں پیش کرنا چاہا۔ لیکن بات نہ بن سکی امریکہ اور برطانیہ کا رویہ ابھی تک یہ ہے کہ وہ اپنے فیصلے پر کاربند رہیں گے لیکن فرانس ایسی درمیانی راہ کے لئے کوشش کر رہا ہے جس میں یوگوسلافیہ اور اٹلی دونوں کے مطالبات میں مفاہمت پیدا کی جاسکے۔

ایک اور ہنگامہ

مغرب میں ایک اور ہنگامہ قابل ذکر اور دلچسپی کا موجب ہے جنوبی امریکہ کے شمال مشرقی ساحل پر چھوٹا سا علاقہ ہے جسے برٹش گیانا کہتے ہیں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ برطانیہ کے قبضہ میں ہے اس علاقہ میں اسی سال اپریل میں نئے آئین کے مطابق انتخابات ہوئے تو پیپلز پروگریسیو پارٹی برسر اقتدار آگئی جس کے لیڈر ڈاکٹر چیدی جگن ہیں یہ پارٹی کمیونسٹ ہے مغرب میں بالعموم اور بحر اوقیانوس کے اس پار بالخصوص یہ پہلا علاقہ تھا جو اس طرح کمیونسٹ اقتدار میں آگیا اس کے نتائج دور رس ہو سکتے تھے حکومت قائم کرنے کے بعد اس جماعت نے جس انداز سے نظم و نسق چلانا شروع کیا وہ برطانیہ کو نہ بھایا اس نے محنت کشوں کی تنظیم کرنا شروع کی، یونین طریق کو رائج کیا۔ برطانوی ملکہ کا احترام چھوڑ دیا گیا وغیرہ۔ برطانیہ چھ ماہ تک تو اس صورت حال کا مطالعہ کرتا رہا بالآخر اس سے رہا نہ گیا چنانچہ اس نے جنگی جہاز اور فوجیں وہاں اتار دیں۔ اور حکومت کو برخاست کر دیا اس اقدام میں برطانیہ کو امریکی تائید بھی حاصل تھی محل وقوع کے اعتبار سے برطانوی گیانا کی صورت حال کا براہ راست اثر امریکہ پر ہی پڑتا ہے یہ تائید کھلی کھلی تھی امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے ایک اعلان میں اسے "کمیونزم کی بین الاقوامی سازش" قرار دیا۔ خود برطانیہ میں یہ قضیہ اختلافی موضوع بن گیا ہے لیبر پارٹی عمومی اعتبار سے اس اقدام کو مستحسن نہیں کہتی۔ سابق نوآبادیاتی وزیر مسٹر گرفتھ نے ایک بیان میں کہا ہے کہ برخاست حکومت کے خلاف کمیونزم کا الزام تو لگا دیا گیا ہے لیکن اس کا ثبوت مہیا کرنا چاہیئے یہ تعجب کی بات ہے کہ سابقہ وزراء میں سے کسی کو اب تک گرفتار نہیں کیا گیا ان کے خلاف تحقیقات ہو رہی ہے اور ثبوت مہیا کئے جا رہے ہیں لیکن اس سے زیادہ اقدام نہیں ہو سکا ڈاکٹر جگن نے اقوام متحدہ اور برطانوی حکومت کو احتجاجی تار بھیجے ہیں وہ بذات خود برطانیہ جا کر اپنا معاملہ صاف کرنا چاہتے ہیں لیکن انھیں وہاں جانے نہیں دیا جا رہا انھوں نے ترک موالات کی تحریک بھی شروع کرا دی ہے اس وقت تمام علاقہ ہیجان و خلفشار کی زد میں ہے برطانیہ اپنی افواج سے صورت حال پر عارضی طور پر قابو تو پا سکتا ہے لیکن اس سے قضیہ حل نہیں ہو سکتا۔ تعجب نہیں کہ برطانوی سلطنت کا یہ علاقہ بھی دوسرا ملایا یا کینیا بن جائے۔

مصری تعطل

پچھلے دنوں نہر سویز سے متعلق برطانوی مصری مذاکرات کی کامیابی کی خبریں آنا شروع ہو گئی تھیں ان سے ایسا پتہ چلتا تھا کہ یہ تصفیہ طے ہو چکا ہے خود ہمارے وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خان صاحب نے اس معاملہ میں کافی دلچسپی کا ثبوت دیا۔

اور مصری اور برطانوی ارباب حکومت سے گفتگوئے مصالحت بھی کی ان کے بیان بھی یہی تھے کہ تصفیہ کا اعلان عنقریب ہو جائے گا لیکن یہ تمام امیدیں مصری وزیر صلاح سالم کے اس بیان سے ختم ہو گئیں جو انھوں نے ۱۱ اکتوبر کو دیا اس میں تلخی کی نمایاں جھلک تھی جو ان توقعات کو جھٹلا رہی تھی جو اس ضمن میں سابقہ خبروں کے ذریعہ پیدا کر دی گئی تھیں انھوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ برطانیہ سے مصالحت ناممکن ہے اس بیان میں بتایا گیا ہے کہ برطانیہ نے انخلائے سویز پر راضی ہو جانے کے بعد یہ شرطیں پیش کیں کہ اگر کبھی ایران اور پاکستان اور ترکی پر حملہ ہو تو برطانوی فوجیں خود بخود (مصر کی اجازت کے بغیر) سویز میں داخل ہو جائیں گی بتدریج برطانیہ نے ایران اور پاکستان کے نام نکال دیئے لیکن ترکی پر وہ اب تک مصر ہے دوسری شرط ان برطانوی کارکنوں یا ماہرین سے متعلق تھی جو انخلاء کے بعد سویز میں رہ جائیں گے ان کی تعداد چار ہزار ہو گی۔ برطانیہ کا اصرار ہے کہ یہ لوگ برطانوی وردی میں ملبوس رہیں لیکن مصر کا اعتراض یہ ہے کہ اول تو انجینئر اپنے فنی کام کے لئے وردی کی ضرورت نہیں دوسرے اتنی بڑی "باوردی تعداد" کی موجودگی سے یہ کہاں سمجھا جا سکے گا کہ برطانیہ سویز کے علاقہ سے نکل گیا ہے۔

ایران ایران کی صورت حال ابھی تک اعتدال پر نہیں آ سکی یہ ملک گہرے اضطراب میں ہے اس کے معاشی بحران کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ اور اندر اندر ایسا مواد پک رہا ہے جو کسی وقت پھوٹ کر ملک کی کایا پلٹ سکتا ہے ڈاکٹر مصدق سابق وزیر اعظم کی قسمت کا فیصلہ بھی ابھی تک نہیں ہو سکا ان کے متعلق وقتاً فوقتاً ہنگامے ہوتے رہتے ہیں ابھی پچھلے دنوں جنوبی ایران میں نازک صورت ہو گئی گو بظاہر حالات پر قابو پا لیا گیا ہے۔ کاشقی قبیلہ جو ڈاکٹر مصدق کا طرفدار ہے اس کے سرداروں نے یہ اعلان کیا کہ اگر سابق وزیر اعظم کو رہا نہ کیا گیا تو وہ بغاوت کر دیں گے اور جنوبی ایران پر قبضہ کر لیں گے اس اٹھتے فتنے کو دبا تو دیا گیا ہے لیکن اس سے تخریب کی شکل پیدا ہو سکتی ہے حکومت نے اسی قبیلہ میں سے اپنے طرفدار پیدا کر لئے اور سیاسی "رشوت" سے انہیں اپنے ساتھ ملا لیا۔ یہ حکمت عملی کامیاب ہو گی یا نہیں اس کے متعلق کچھ کہنا قبل از وقت ہے لیکن یہ خوش آیند یقیناً نہیں شاہ ایران کی پوزیشن فی الحال مستحکم نظر آتی ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایسی ہی رہے گی یا ان میں اور موجودہ وزیر اعظم میں رسہ کشی شروع نہیں ہو جائے گی شاہ عنقریب مجلس کو ختم کر کے نئے انتخابات کرا رہے ہیں ان انتخابات میں جنرل زاہدی جو رویہ اختیار کریں گے اس سے اندازہ ہو سکے گا کہ ایران کی عنان اقتدار کس کے ہاتھ میں رہے گی۔

ایرانی حکومت کمیونسٹ خطرہ کو دبانے میں ہمہ تن مصروف ہے مجلس نے ایک قانون منظور کر کے کمیونسٹ سرگرمیوں کے لیے موت کی سزا مقرر کی ہے کمیونسٹ گروہ پہلو بدل بدل کر حکومت کی مخالفت کر رہے ہیں وہ شاید سخت گیر پالیسی سے دبائے جا سکیں لیکن ان کا حقیقی علاج یہ ہے کہ ملک کے معاشی حالات سدھر جائیں۔ اور ایران کی معاش درست ہونے کی صورت یہ ہے کہ اس کے تیل کے کارخانے پھر سے چلنے شروع ہو جائیں۔

اور تیل فروخت ہونا شروع ہو جائے اس کے متعلق حالات ابھی تک امید افزا نظر نہیں آتے تیل کے محاذ پر کسی قسم کے مذاکرات نہیں ہو سکے درحقیقت ایران بالکل اس پوزیشن میں نہیں کہ وہ برطانیہ سے جو ڈھائی سال سے تیل کے معاملہ میں غیر معمولی ہٹ دھرمی دکھا رہا ہے کسی قسم کا سودمند تصفیہ کر سکے اور جب تک کہ تصفیہ نہیں ہو جاتا ایران کا اندرونی اضطراب کم نہیں ہو سکتا امریکہ تیل کے مسئلہ میں کافی دلچسپی لے رہا ہے ابھی دنوں مسٹر ایڈگر ہوور۔ صدر آئزن ہاور کا مشیر خصوصی نفت طہران پہنچا ہے گو اس ضمن میں رازداری سے کام لیا جا رہا ہے تاہم قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ تیل کے تصفیے سے متعلق برطانیہ کی تازہ پیشکش ساتھ لایا ہے کیا امریکہ برطانیہ کی جگہ لے رہا ہے یا برطانیہ کے لئے راستہ صاف کر رہا ہے اس کا جواب وقت دے گا۔

فلسطین

فلسطین میں یوں تو یہودی کبھی نچلے نہیں بیٹھے تھے لیکن ان دنوں وہ زیادہ سرگرم نظر آ رہے ہیں۔ یہودی فلسطین کوئی ایسا علاقہ نہیں جو ایک چلتی ہوئی ریاست بن سکے۔ وہ مجبور ہیں کہ اپنے علاقہ کو توسیع دیں یوں بھی ان کے ہاں آبادی اتنی زیادہ ہو رہی ہے کہ توسیع ان کے لئے ناگزیر ہے چنانچہ وہ بتدریج اپنے قدم پھیلاتے جاتے ہیں ان دنوں وہ سرحدوں پر غیر مضافی علاقوں پر قبضہ کر رہے ہیں نیز دریائے اردن کا رخ بدلنے میں مصروف ہیں چونکہ ان کے پاس پیسہ ہے اور دولِ عظمیٰ کی تائید و مدد بھی انہیں حاصل ہے اس لئے دریاؤں کا رخ بدلنا ان کے لئے کوئی بڑی بات نہیں ان کی ان کارروائیوں سے اردن اور مصر کی سرحدوں پر چپقلش بھی ہوتی رہتی ہے اب پچھلے دنوں عربوں کے احتجاج پر اقوام متحدہ کے مبصر خانہ کے جنرل بینیک (GEN. BENNICKE.) نے یہودیوں سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ ان کارروائیوں سے دستبردار ہو جائیں اور باہمی طور پر نزاع کا حل کر لیں لیکن یہودیوں پر اس دعوت کا کوئی اثر نہیں ہوا اور وہ بدستور اپنے کام میں مصروف ہیں اس سے سرحدی عربی ممالک میں تشویش و اضطراب بڑھ گیا ہے اور معاملہ اقوام متحدہ تک پہنچایا جا رہا ہے۔

مراکو فرانسیسی دستِ تظلم کا پوری طرح شکار ہے اور بظاہر اس سے گلو خلاصی کی امید نظر نہیں آتی گذشتہ دسمبر میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے فرانس سے درخواست کی تھی کہ وہ مراکو سے گفتگوئے مصالحت جاری رکھے اس پر فرانس نے عمل درآمد کیا اور اس نے محسوس کیا کہ مراکو کا سلطان اس کے راستے میں حائل ہے کیونکہ وہ اصلاحات کے مرجھائے ہوئے پھول اپنے قفس میں رکھنے کے لئے تیار نہ تھا چنانچہ مقامی رقابتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فرانس نے اپنا مہرہ آگے بڑھایا اور مراکش کے سردار کو جو عرصے سے سلطان کا حریف چلا آ رہا تھا سلطان کی بجائے تخت نشین کر دیا سلطان پر الزام یہ لگایا گیا کہ وہ اصلاحات قبول کرنے سے پہلو تہی کر رہا ہے نیز اس کے رجحانات مذہبی ترقی پسندانہ یعنی غیر اسلامی ہوتے جا رہے تھے اس پر عرب ایشیائی گروہ نے یہ معاملہ سلامتی کونسل میں اٹھایا لیکن مسترد ہو گیا بالآخر جنرل اسمبلی کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا وہاں باریابی تو ہو گئی ہے اور مراکو پر بحث بھی شروع ہو گئی ہے لیکن کسی خاطر خواہ نتیجہ کی توقع عبث ہے مراکو کے تصفیہ کے سلسلہ میں عرب ایشیائی گروہ نے جو قرارداد پیش کی ہے اس کا لب لباب یہ ہے کہ مراکو میں مارشل لا ختم کر دیا جائے اور نئے انتخابات کرا کر ازسرنو مذاکرات شروع کئے جائیں اور پانچ سال کے عرصے میں اس ملک کو آزادی مل جائے ہرچند مطالبہ معقول ہے اور اس میں کوئی ایسی شرط نہیں جسے فرانس منظور نہ کر سکے یا جس پر کوئی آزاد قوم اعتراض کر سکے تاہم اس کے مقابلہ میں جنوبی امریکہ والوں کی طرف سے ایک اور قرارداد سامنے آ گئی ہے یہ قرارداد گذشتہ دسمبر کی منظور کردہ قرارداد کے مطابق ہے اور اس میں فرانس سے ایک مرتبہ پھر درخواست کی گئی ہے کہ وہ مذاکرات جاری رکھے اب جبکہ جنوبی امریکہ کی طرف سے متبادل قرارداد سامنے آ گئی ہے اس لئے بظاہر یہی توقع کی جا سکتی ہے کہ یہی بے معنی قرارداد منظور ہو جائے گی اور معاملہ وہیں کا وہیں رہے گا۔

قیادت کا فقدان

ممالک اسلامیہ کے مصائب کو بنظر غائر دیکھا جائے تو یہ حقیقت بخوبی روشن ہو جائے گی کہ ان میں قیادت کا افسوسناک حد تک فقدان ہے۔ صحیح قیادت کی کمی کی وجہ سے اقوام اسلامیہ کے دل و دماغ پر خلا کا قبضہ ہے اور جس معرکے میں [illegible] ہوتے ہیں اس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے اس پر شاید ہی کوئی ایسا اسلامی ملک ہو گا جس کے تازہ کوائف اس کے گواہ نہ ہوں انڈونیشیا ایسے ہی بحران سے گذر رہا ہے انڈونیشیا نے جس پامردی سے جنگ آزادی لڑی اس سے اس نے دیگر اقوام کے دلوں میں اپنا گھر کر لیا تھا لیکن آزادی کے بعد سے وہ قیادت میسر نہ آ سکی جو اسے شاہراہ ترقی و کامرانی پر گامزن کر دیتی اس میں آئے دن ایسے فتنے اٹھتے رہتے ہیں جن سے یہ حقیقت واضح تر ہو جاتی ہے کہ انڈونیشیا

جری قائدین سے محروم ہے حال ہی میں وہاں بغاوت کے شعلے پھر بھڑک اٹھے۔ بغاوت اس پارٹی کی طرف سے ہوئی جو اپنے آپ کو "دارالسلام" کے نام سے یاد کرتی ہے اور اسلامی حکومت کے خواب دیکھ رہی ہے ۲۰ ستمبر کو پہلی مرتبہ یہ خبر آئی کہ شمالی سماٹرا کے علاقہ آرچاہ میں دارالسلام نے اسلامی حکومت قائم کرلی ہے یہ جماعت منظم اور وسیع ہے اور اس کے کوئی تیس ہزار ارکان ہیں اس کی سرگرمیاں دہشت پسندانہ ہیں حکومت کے نزدیک یہ باغی ہیں جو جمہوریہ انڈونیشیا کو ختم کر دینا چاہتے ہیں"۔ ان کی وجہ سے ملک وقتاً فوقتاً بدامنی اور خانہ جنگی میں مبتلا ہو جاتا ہے اور یہی انڈونیشیا کی اہم کمزوری ہے اس کمزوری کا نتیجہ ہے کہ کوئی مستحکم حکومت قائم نہیں ہو سکتی اور جو قائم ہوتی ہے وہ ملک کو جرأت مندانہ قیادت مہیا نہیں کر سکتی اس تازہ فتنے سے کافی تباہی مچی بعض اطلاعات کے مطابق متعدد سینکڑوں آدمی خونریز جنگوں میں کام آئے بعض گاؤں تباہ ہو گئے لیکن اس تباہی سے کہیں زیادہ خطرناک اور سنگین وہ داخلی خلفشار ہے جو ان جنونی سرگرمیوں سے بڑھ رہا ہے اندونیشی ملا ازرہ غایت بے خودی اپنے ملک کو تباہ و برباد کر رہے ہیں۔ وہ اسلامی حکومت کے خواب تو دیکھ رہے ہیں لیکن اسلامی حکومت بنانے میں کامیاب ہو گئے تو انڈونیشیا قبرستان بن چکا ہوگا یا پھر سے کسی بیرونی طاقت کا غلام اب بھی ان کی تخریبی سرگرمیوں سے کمیونسٹ فائدہ اٹھا رہے ہیں جو محض برسراقتدار حکومت کو کمزور کرنے کے لئے ان کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں گویا دارالسلام صریحاً کمیونسٹوں کے آلۂ کار بن رہے ہیں اور ملک کو ہلاکت اور غلامی کی طرف دھکیل رہے ہیں۔

پاکستان

پاکستان جس منزل سے گزر رہا ہے اس کا نمونہ کاروبار آئین سازی میں بخوبی مل جاتا ہے اگر قائدین ملک فکر اور جرأت کے مالک ہوتے تو آج ملک اس انتشار کا شکار نہ ہوتا گو کہنے کو آئین کا مسئلہ ایک حد تک حل ہو گیا ہے لیکن اس کی عملی کامیابی کے امکانات چنداں روشن نہیں۔ آئین کی کامیابی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تو وہ علاقائی تعصب اور تنگ نظری ہے جس کا مظاہرہ نام نہاد قائدین ملک کر رہے ہیں ایک طرف مشرقی پاکستان نے اس افسوسناک ذہنیت کا مظاہرہ کیا کہ ہندو ارکان اسمبلی تک کو دعوت دی کہ وہ مجوزہ آئین کی مخالفت میں ان کا ساتھ دیں۔ دوسری طرف سندھ کی نئی منتخب اسمبلی کا جو مختصر سا اجلاس منعقد ہوا اس میں "سندھی قومیت" کا تصور ابھر کر سامنے آگیا اس اسمبلی میں جی۔ ایم سید صاحب نے ایک یادداشت پیش کی جس میں مرکز کے خلاف سندھ کی شکایات تھیں اس میں وہ یہاں تک بہہ گئے کہ انھوں نے محض سندھ کو ایک الگ قومیت قرار دیا بلکہ پاکستان کو مختلف قومیتوں کا وطن کہا گویا محض سندھ کے لئے بلکہ تمام "قومیتوں" کے لئے خود مختاری کی ضرورت ہے اس فضا میں وحدت پاکستان کا تصور مفقود ہو جاتا ہے یہی ذہنیت پاکستان کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے لیکن ہماری قیادت اسی سے غافل ہے یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب سید صاحب سندھ اسمبلی میں یادداشت پڑھ رہے تھے تو ہر طرف سے انھیں بے ساختہ داد دی جا رہی تھی دوسرے دن الٰہی بخش پیرزادہ صاحب نے مرکز کی وکالت کی اور اس طرح گویا یادداشت میں سے قومیت کا لفظ نکال دیا گیا لیکن اس کا زہر عملاً وہی تھا اور وہی رہا۔

اسلامی آئین

آئین کے متعلق سیاسی پہلو پر تصفیہ ہو چکا ہے اور اب اس کا اسلامی پہلو مسلم لیگ پارٹی کے زیر غور ہے آئین کے سیاسی پہلو نے اب تک توجہات کو اس حد تک جذب کئے رکھا ہے کہ اس کے اسلامی پہلو کو کم سوچا گیا ہے اب بھی اس پر سنجیدہ نگاہی سے غور نہیں کیا جا رہا۔ اس کے متعلق یہ اصولی شق کہ تمام فیصلے "قرآن اور سنت" کے مطابق ہوں گے سب کے نزدیک مسلّمہ ہے حالانکہ "سنت" کی آڑ ہی تمام مذہبی فرقہ بندیوں اور پریشان خیالیوں کی بنیاد ہے بہرکیف اس کے متعلق دو الجھنیں ہمارے آئین سازوں کے لئے پریشانی کا باعث ہو رہی ہیں ایک وہ علماء بورڈ کا ڈھونگ ہے جو بنیادی اصولوں کی دوسری سفارشات نے رچایا تھا دیکھئے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے اپنے طور پر فیصلہ

کرلیا ہے کہ یہ مذاق ختم کر دیا جائے اور عملی طور پر ڈرا دیا جائے اس کے بجائے یہ اختیار عدالتِ اعلیٰ کو دیا جائے کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ آیا کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف ہے یا نہیں اس ترمیم کا ایک فائدہ یہ نکل سکتا ہے کہ تشریح کا کام قانون دانوں کے ہاتھ میں رہے گا اور اس میں ملاؤں کا کوئی اثر دخل نہیں ہوگا۔

دوسری الجھن یہ آپڑی ہے کہ آیا مملکت پاکستان کا کوئی مذہب ہونا چاہیئے یا نہیں عام طور پر جذباتی نقطۂ نگاہ سے قریباً سبھی یہی کہہ رہے ہیں کہ مملکت کا مذہب ضرور ہونا چاہیئے کیونکہ جب حکومت اسلامی ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کا مذہب اسلامی نہ ہو یہ ایک علمی مسئلہ ہے اور اس کا پیدا ہونا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس حلقے میں علم کی دولت کس قدر ہے مملکت ایک مجرد تصور ہے اور اس کا کوئی تشخص نہیں ہوتا اس لئے اس کے مذہب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا مذہب افرادِ مملکت کا ہوگا اور وہی اس نصب العین کی طرف حرکت کرینگے جو آئین کی رو سے متعین کر دیا جائیگا۔

آئین کی جنگ میں کشمیر کا مسئلہ دب کر رہ گیا ہے ہندوستان اطمینان سے کشمیر کو کلی طور پر ہندوستان میں جذب کرنے میں مصروف ہے۔ ان دنوں البتہ پاکستان مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں کشمیر کا ذکر آیا جب کہ کئی ارکان نے مطالبہ کیا کہ اس نازک مسئلہ کا فوری حل تلاش کیا جائے اس کے جواب میں وزیر داخلہ مشتاق احمد گورمانی نے مدلل تقریر کی اور ارکان کونسل کو یہ دلائل قائل کرانا چاہا کہ کشمیر میں عبداللہ کے زوال سے جو صورتحال پیدا ہوئی ہے اس سے ہندوستان اپنا مقدمہ کشمیر ہار چکا ہے۔ ہندوستان اپنا مقدمہ ہارے یا نہیں اتنا یقینی ہے کہ کشمیر بدستور اسی کے تصرف میں ہے اور اہل کشمیر بدستور غلام ہیں پورے چھ سال میں بھی ہمارے قائدین کشمیر کی اس بنیادی حقیقت کو سمجھ نہیں سکے۔

مسلم لیگ کی بساط

مسلم لیگ کی بساط پر ان دنوں چہل پہل نظر آ رہی ہے پچھلے دنوں کراچی مسلم لیگ کا اجلاس بدیں غرض منعقد ہوا کہ وہ پاکستان مسلم لیگ کونسل کے لئے اپنے نمائندے منتخب کرے واضح رہے کہ کئی ہنگاموں اور سر پھٹول کے بعد اس لیگ کو توڑ دیا گیا تھا اور بڑی مشکل کے بعد برسوں میں ستمبر کے آخر میں اس جماعت کی تشکیل و ترتیب ہو سکی ہے ترتیب کی بھی صورت یہ رہی کہ جب پاکستان مسلم لیگ کے قائم مقام صدر یوسف ہارون کو یہ معلوم ہوا کہ فلاں فلاں کراچی لیگ کے عہدیدار منتخب ہو گئے ہیں تو آپ نے فوراً "حکم امتناعی" جاری فرمایا کہ صدر کو تو خیر رہنے دیجئے لیکن دوسرے عہدیداروں کو ابھی عہدے اور متعلقہ کاغذات سپرد نہ کئے جائیں کیونکہ ان کے کہنے کے مطابق ان کے خلاف بعض بے ضابطگیوں کی تحقیقات ہو رہی ہے کچھ عرصے کے بعد سیٹھ ہارون صاحب نے یہ حکم منسوخ کر دیا اور یہ بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ تحقیقات کا کیا نتیجہ نکلا اس لیگ کے اجلاس میں کافی گہما گہمی رہی مخالف پارٹیاں جن کی رقابتوں سے لیگ معطل ہوئی اور اس کا منظم ہونا امر محال نظر آتا تھا انہوں نے اس اجلاس کو بھی اکھاڑہ بنایا ایک صاحب نے سٹیج پر چڑھ کر میز الٹ دی اس کے بعد ہاتھا پائی ہوئی اور اس ہنگامے میں پاکستان مسلم لیگ کونسل کے لئے نمائندے منتخب ہو گئے۔

اس کے بعد پاکستان مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا اس میں محمد علی صاحب وزیر اعظم پاکستان کو مسلم لیگ کا صدر چن لیا گیا یہ حسب توقع تھا البتہ حیران کن یہ بات تھی کہ بلوچستان کے قاضی عیسیٰ صاحب نے ان کا مقابلہ کیا اور بلوچستان کے تمام ارکان نے انہیں ووٹ دیئے نظم و ضبط کے اعتبار سے یہ جلسے بھی اپنا نمونہ آپ تھے کافی ہڑبونگ مچی رہی اور خلفشار رہا جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ قائدین پاکستان کا معیار سیاست کتنا اونچا ہے درحقیقت یہ سارا فتنہ پیدا ہی اس لئے ہوتا ہے کہ حکومت (جو ملت کا مرکزی ادارہ ہے) کو چھوڑ کر ایک اور جماعت پیدا کی جاتی ہے۔

جو ہر قسم کی رقابتوں اور منافرتوں کی رزمگاہ بن جاتی ہے ہماری سیاسی زندگی کا یہ گھناؤنا باب آج ختم ہو سکتا ہے بشرطیکہ پارٹیوں کی بساط کو تہ کر کے رکھ دیا جائے جب تک ملک میں کوئی ایک پارٹی بھی موجود ہے ملت ایسے فتنوں سے محفوظ نہیں رہ سکتی اس کا علاج وہی ہے جسے طلوع اسلام پہلے دن سے پیش کرتا چلا آرہا ہے یعنی پاکستان میں بسنے والی پوری کی پوری ملت کو ایک پارٹی (جماعت) تصور کیا جائے اور اس کے اندر کسی پارٹی سازی کی اجازت نہ دی جائے اس کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے مسلم لیگ کو ختم کیا جائے۔

ہماری آنے والی کتابیں

(۱) مقام حدیث حدیث کے متعلق طلوع اسلام میں اسقدر بحث آچکی ہے کہ اس کی روشنی میں وہ سب کچھ سمجھ میں آسکتا ہے جو آپ حدیث کے متعلق جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ ان تمام مباحث کو ایک نئی ترتیب کے ساتھ یک جا شائع کیا جا رہا ہے جو قریب چار چار سو صفحات کی دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ کتاب عنقریب تیار ہو جائیگی

۲۔ فردوس گم گشتہ مفکر قرآن جناب پرویز کے ان بلند پایہ مضامین کا مجموعہ جنہوں نے قوم کے ہوشمند طبقہ کے قلب و نگاہ میں صالح انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ قریب چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی کتاب ہے۔

۳۔ اقبال اور قرآن آج جناب پرویز سے بہتر اقبال کا سمجھنے والا شاید ہی کوئی ہو۔ اسلئے کہ اقبال نے جو کچھ کہا وہ قرآن سے کہا اور جناب پرویز اقبال کو قرآن سے سمجھتے اور قرآن ہی سے سمجھاتے ہیں۔ اس مجموعہ میں اقبال کے متعلق ان کے مضامین اور تقاریر کو بہ ترتیب جدید جمع کر دیا گیا ہے۔ دو سو صفحات سے زائد کی کتاب ہے۔

۴۔ قرآنی نظام ربوبیت جو مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی دفعہ مرتب کیا گیا ہے اور جو اس کے بعد اس معاشرہ کے منشور کی حیثیت اختیار کرے گا جسے قرآن متشکل کرنا چاہتا ہے۔ ایک بے نظیر تصنیف ہے جو جناب پرویز کے مدت العمر کے قرآنی فکر کا ماحصل ہے۔

ناظم ادارۂ طلوع اسلام۔ کوی روڈ۔ صدر، کراچی

رجم کا ناقابلِ تردید ثبوت

اگرچہ احادیث میں یہ آیا ہے کہ جن ابنائے اسرائیل کو خنزیر اور بندر بنا دیا گیا تھا وہ تین دن سے زیادہ زندہ نہ رہے اور ان کی نسل نہ چل سکی لیکن یہ امکان ہے کہ شاید ایک آدھ جوڑا عذاب ہلاکت سے بچ گیا ہو اور اس کی نسل چل نکلی ہو اور انھوں نے آئندہ متبع شریعت رہنے کا عہد کر لیا ہو۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ دنیا میں ان ہی بنی اسرائیل کی ایک شاخ باقی رہ گئی تھی جو اگرچہ رہی تو بندر ہی، لیکن ڈارون صاحب کے قانون ارتقا کے مطابق پھر انسان بن جانے کی توقع میں باقاعدہ اتباعِ شریعت کا خیال رکھتے ہوں۔ چنانچہ دیکھئے دنیا کی سب سے زیادہ معتبر کتاب میں جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے، یہ روایت درج ہے کہ:

> عن عمرو بن میمون، قال رأیت فی الجاھلیۃ قردۃ اجتمع علیھا قرد وقد زنت فرجموھا فرجمتھا معھم۔
>
> یعنی میں نے ایام جاہلیت میں ایک بندری کو دیکھا کہ بہت سے بندر اس کے گرد جمع ہیں۔ اس بندری نے زنا فرمایا تھا لہٰذا بندروں نے اسے رجم کیا اور میں بھی ان بندروں کے ساتھ رجم کرنے میں شریک رہا۔

ہمیں اس سے کچھ بحث نہیں ہونا چاہئے کہ:

> جس بندر نے اس بندری کے ساتھ زنا فرمایا تھا وہ خود کہاں بھاگ گیا اور اسے رجم کیوں نہیں کیا گیا؟ ہو سکتا ہے کہ وہ کہیں نکل بھاگا ہو، یا گرفتاری سے پہلے ہی مر گیا ہو یا بندری حاملہ پائے جانے کی وجہ سے ماخوذ ہو گئی ہو اور اس نے زانی بندر کا پتہ بتانا مناسب نہ سمجھا ہو۔

یہ تحقیق کرنے کی بھی ضرورت نہیں کہ

> وہ محصنہ تھی یا غیر منکوحہ۔ قرینہ یہ ہے کہ وہ محصنہ ہو گی اور اسکا کسی بندر سے باقاعدہ نکاحِ شرعی ہوا ہو گا جب ہی تو اسے رجم کیا گیا۔

اس بحث میں پڑنے کی بھی ضرورت نہیں کہ

> اس بندری نے خود ہی حلفیہ اقرار کر کے اپنی تطہیر کی خواہش ظاہر کی تھی یا دوسرے گواہوں نے شرعی عینی شہادت (کالمیل فی المکحل) کی دی تھی۔ بہرحال کچھ ہوا ہی ہو گا۔

یہ دریافت کرنے کی بھی چنداں حاجت نہیں کہ

> راوی کو بندری کے جرم زنا کی خبر عوام بندروں نے دی تھی یا بندروں کے قاضی صاحب نے۔ ظاہر ہے کہ جب رجم ہو رہا تھا تو ایک محصنہ کے زنا ہی کی سزا میں ہو رہا ہو گا۔ اسلئے قطعی قرآن سے معلوم کرنے کے بعد راوی نے بھی اس نیکی میں شرکت کر[...] کے لئے رجم میں ساتھ دیدیا۔

بہرکیف خواہ مخواہ ان شبہات میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ دیکھنا تو صرف یہ ہے کہ رجم زانی ایک ایسی فطری سزا ہے جو بندروں تک میں مقبول ہے۔ مگر یہ اشرف المخلوقات انسان عجیب مخلوق ہے جو بندروں سے ایک دو درجے اوپر ہونے کے باوجود اس سزا کو نافذ کرنے سے ہچکچاتا ہے حالانکہ صاف صاف قرآن کی آیت موجود ہے کہ

الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ الخ

شیخ اور شیخہ زنا کریں تو ان دونوں کو قطعاً رجم کر دو۔

اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ شیخ اور شیخہ کے معنی لغت عرب میں محصن اور محصنہ ہی کے ہیں۔

آپ زیادہ سے زیادہ یہی پوچھ سکتے ہیں کہ یہ کس پارے کس سورہ اور کس رکوع کی آیت ہے؟ لیکن یہ کیا ضرور ہے کہ جس آیت کا صحیح حوالہ نہ دیا جا سکے وہ آیت ہی نہ ہو۔ آخر ایسی بھی تو آیتیں ہیں نا جو قرآن میں اگرچہ موجود نہیں لیکن ہیں وہ آیتیں۔

اس فقرے کے آیتِ قرآنی ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ (بروایت ابن عباسؓ) حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ:

اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ عمر نے قرآن میں اضافہ کر دیا تو میں اس آیت کو ضرور داخلِ قرآن کر دیتا (رواہ الخمسہ)

آپ اس پر صرف یہی شبہ وارد کر سکتے ہیں کہ اگر یہ آیت قرآن میں موجود نہیں تو قرآن کی محفوظیت کا دعویٰ کیونکر صحیح ہوا ہے لیکن یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ محفوظیت کے یہ معنی تو نہیں کہ قرآن کے اندر ہی محفوظ ہو۔ محفوظ ہونا چاہیے خواہ کسی جگہ ہو۔ چنانچہ یہ آیتِ رجم بھی احادیث میں محفوظ ہے۔ انا لہ لحٰفظون میں اب کیا شبہ رہ جاتا ہے؟

حمیدی فرماتے ہیں کہ غالباً یہ روایت (کہ بندروں نے بندری کو سنگسار کیا) بخاری میں الحاق کر دی گئی ہے۔ لیکن ہم لوگوں کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ البارئ کے متعلق ہرگز ایسے سوئے ظن سے کام نہیں لینا چاہیے کہ اس میں کوئی روایت الحاقی بھی ہو گی۔ قرآن سے کسی آیت کا (آیت رجم کی طرح) غائب ہو جانا اور نہ لکھا جانا تو سمجھ میں آ سکتا ہے لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آ سکتی کہ اصح الکتب میں کوئی روایت الحاق کر دی گئی ہو گی۔ درانحالیکہ امام بخاریؒ نے بقول حمیدی تاریخ کبیر میں بھی یہ روایت نقل فرمائی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس میں قد زنت (اس بندری نے زنا کیا تھا) کا لفظ نہیں —— حمیدی نے اس روایت کو الحاقی بتلانے کی تکلیف بیکار کی ہے۔ جب انسان نے جانوروں سے اتنا کچھ اور سیکھا ہے تو کچھ بندر بھی عمرو بن میمونؓ کو یہ بتا سکتے ہیں کہ دیکھو شریعت موسوی (یا آئندہ نازل ہونے والی آیت رجم) پر اس طرح عمل کیا جاتا ہے۔

کیا اب بھی آپ کو رجم کے اسلامی سزا ہونے میں شک ہے؟

(ابنِ آدم)

سیرت صاحب قرآن خود قرآن کے آئینہ میں

معراجِ انسانیت

معارف القرآن جلد چہارم

ترجمانِ حقیقت جناب پرویز کا قلم اور سیرت صاحب قرآن علیہ التحیہ والسلام، خود قرآن کے آئینہ میں فی الحقیقت ہمارے اسلامی لٹریچر میں اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور نہایت کامیاب۔ شروع میں قریب پونے دو سو صفحات میں دنیا کے تمام مذاہب کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر ہے۔ اس میں بعض ایسے مذاہب کا بھی تذکرہ ہے جن کا شاید نام بھی آپ نے پہلے نہ سنا ہوگا۔ پھر نادر عنوانات کے ماتحت سیرت حضور سرورِ کائنات جس میں دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں۔ کتاب بڑے سائز کے ۸۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقدمہ و فہرست کے ابتدائی پچاس صفحات اس سے الگ ہیں۔

کاغذ اعلیٰ درجے کا ولایتی گلیزڈ۔ جلد مضبوط اور حسین۔ گرد پوش مرصع اور دیدہ زیب۔ ٹائیٹل اور صبح بہار کے عنوانات منقش اور رنگین۔

قیمت بیس روپے۔ محصول ڈاک و پیکنگ ایک روپیہ ساڑھے چھ آنے۔

نوادرات

مجموعہ مضامین علامہ اسلم جیراجپوری

بڑا سائز ضخامت چار سو صفحات قیمت چار روپے محصول ڈاک نو آنے

ادارہ طلوع اسلام۔ گوری روڈ۔ صدر۔ کراچی